سوچیں!

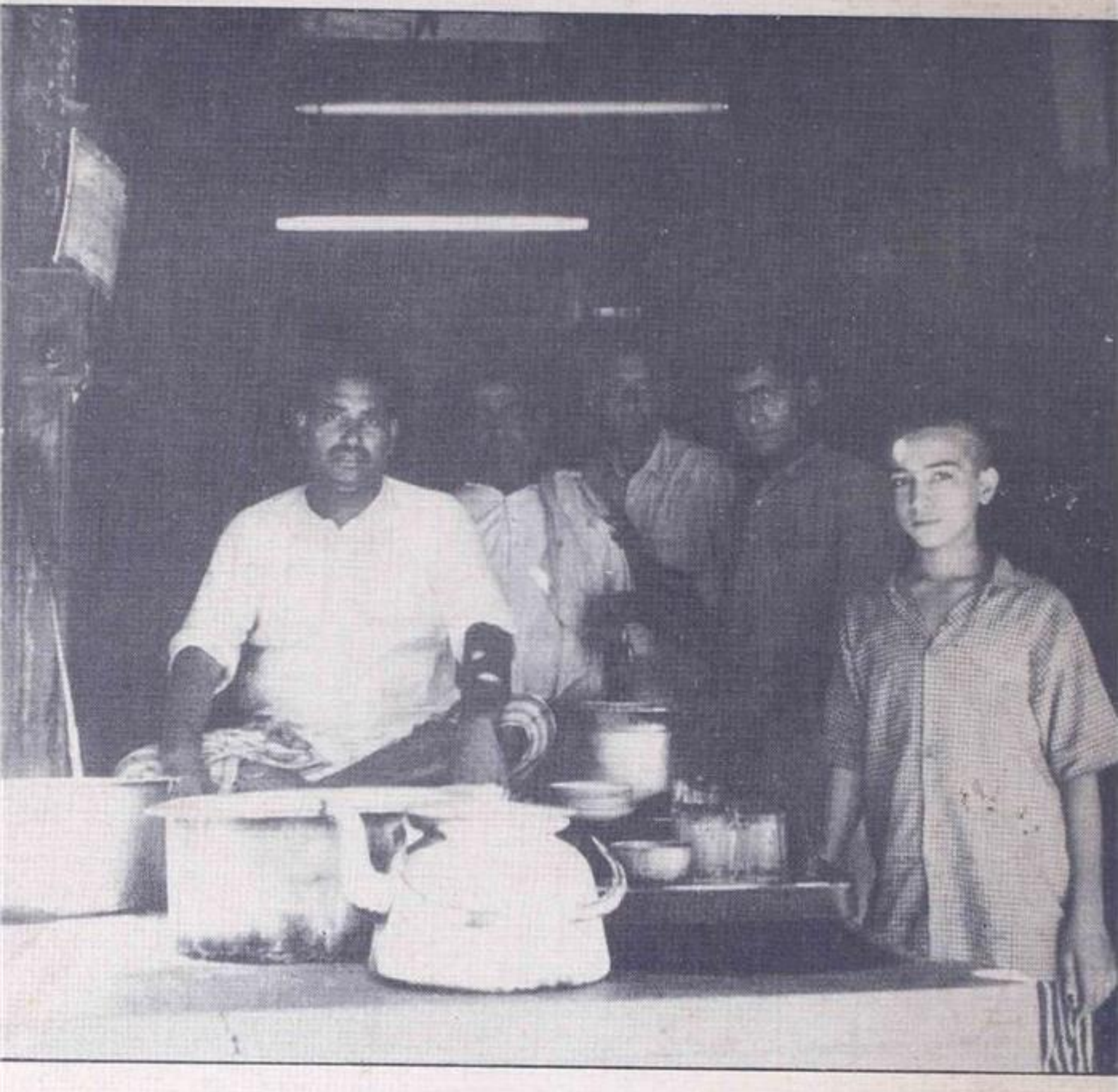

سائیں سچاؔ　　　سعید انجم

سعید انجم

سچا

جُملہ حقوق محفوظ سعید انجم وسائیں سچا

اشاعت کا سال 1996

کمپیوٹری کتابت ودیا کتاباں، سویڈن

اشاعت ودیا کتاباں
بکس نمبر 6099
19206 سولینتونا، سویڈن

طباعت انٹرنیشنل ترِک
اوپسالا
سویڈن

سرورق "میدھے کا ہوٹل"، مزنگ، لاہور۔

ISBN 91 86620 16 9

انتساب

اُن دوستوں کے نام
جو جہاں بھی ہوں
ہمیشہ
دِل کے
قریب ہوتے ہیں

فہرست

سعید انجم

جھوٹ سچ	15
دھوپ کی وسعت	21
بے حساب — با حساب	37
دالان کی دھوپ	47
قدر و قامت	53

سائیں سچُا

کالے جوُتے	63
بلکہ ...	69
نجات	77
سراب	93
دھنک	105

سعید انجم

دریچے اور دالان

زیر نظر مجموعہ میں افسانے تو میرے بھی شامِل ہیں لیکن اس کتاب کی اشاعت اکیلے سائیں سچّا کا کارنامہ ہے۔ دوسرں کے ساتھ مِل کر کام کرنے کا جو شوق انہیں ہے، یہ افسانوی مجموعہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ایک اور ایک گیارہ کے جادو پر موصوف کا ایمان کامل ہے۔

بچپن میں کئی ایسے افراد کو دیکھا جو جادو ٹونے کو برحق جانتے تھے۔ چنانچہ کوئی نوٹ دوگنے کرنے کی تگ و دو میں ہوتا اور کسی کے زیورات جاتے رہتے۔ یورپ کے شمالی خطّے سکینڈینیویا میں جادوگروں کی یونین دستیاب ہے لیکن وہ صرف تماشہ کرتے ہیں اور دِل بہلاتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی پرانے مرض کا علاج کر دینے کا دعویٰ سننے میں آ جاتا ہے لیکن معاشرہ ایسے دعویداروں کو جادوگر نہیں مانتا۔

معاشرتی عقیدوں کی اپنی ایک منطق ہے۔ ایک گروہ جس دیوتا کے پاؤں چومتا ہے دوسرے معاشرے میں اسی کی کھوپڑی سے فٹ بال کھیلنا بابرکت سمجھا جاتا ہے۔ ماہرین سماجیات کے خیال میں ان رویّوں کی جڑیں تاریخ میں دستیاب ہیں۔ کچھ لوگ جغرافیے کو بھی اس کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ برفانی خطّوں میں لوگ جو مزہ دھوپ کا لیتے ہیں خط استوا کے قرب میں وہی مزہ ابر کے ساتھ مخصوص ہے۔

تارکیں وطن ہم عصر دنیا کا نیا موضوع ہیں۔ جادو ٹونے کی سرزمینوں سے لوگ کھیل تماشے کے پنڈالوں میں چلے آئے ہیں۔ دنیا ٹیلی ویژن کی سکرین میں سمٹ چکی ہے۔ حقیقت اب اسی کا نام ہے جو کیمرہ دکھا دے۔ جو منظر اوٹ میں ہے یا دکھانے، بتانے والے کے معیار پر پورا نہیں اترتا، اس کا سکرین پر کوئی وجود نہیں ہے۔ جو سکرین پر موجود نہیں اس کے بارے میں تصوّر اور تخیّل متحرک نہیں ہو پاتے۔ لیکن تصوّر اور تخیّل کا کل اجارہ فی الحال ٹی وی کے پاس نہیں ہے۔ لفظ تخلیق کرنے والے ابھی موجود ہیں اور ان کو پڑھنے والے دستیاب۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اس کتاب میں موجود افسانے ان دریچوں کی مانند ہیں جو ٹی وی سکرین کے پیچھے دالان میں کھلتے ہیں۔ اگر کوئی جادو ٹونا آپ کو نظر آئے گا تو کسی پرانے مرض سے نبرد آزما ہونے کیلئے۔ کھیل تماشے کے پنڈال میں سرکس تب ہی شروع ہوتی ہے جب سدھائے ہوئے جانوروں کیلئے ایک اصطبل پچھواڑے میں موجود ہو۔ ترک وطن کا تجربہ کرتب دیکھنے اور اصطبل میں جھانکنے کے مواقع مہیا کرتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں آپ کو معاشرتی عقیدوں کے چابک سے سدھائے ہوئے کردار بھی نظر آئیں گے۔ کبھی تماشائیوں کے سامنے کرتب دکھاتے ہوئے تو کبھی راتب کے انتظار میں ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ کسی کو برفانی موسم میں دھوپ کا انتظار ہے تو کوئی جھلستی دھوپ میں شجر سایہ دار کی تلاش میں۔ اور پھر ایسے کردار بھی جو آج کسی سایہ دار دیوار کے ساتھ بیٹھ

کر بھی ماضی کی جھلسا دینے والی یادوں کی حدّت کے زد میں ہیں۔
کرداروں کی ان مصروفیات کے دوران ان کی جذباتی کیفیات بیان کرنے
کیلئے یہ افسانے لکھے گئے ہیں۔
آپ کو یہ کیسے لگے؟
مجھے اور سائیں سچّا کو آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

سعید انجم

اوسلو

۱۶ جون، ۱۹۹۶

جھوٹ سچ

ٹیلی ویژن پر آنے والے پروگراموں کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جب سکرین پر باربرو نظر آئی۔ وہ "ٹوٹے ہوئے رشتے" نامی پروگرام میں آ رہی تھی۔ طویل عرصے سے روٹھے ہوئے لوگوں کو اس پروگرام میں بلایا جاتا۔ کئی کئی سال کی ناراضگی کے بعد ٹی وی کے مہمان ناظرین کی سامنے کیمروں کی روشنی میں ایک دوسرے سے ملتے اور اپنے گلے شکوے دور کرتے۔ حقیقی زندگی کے یہ جذباتی مناظر عورتوں میں خاص طور پر مقبول تھے۔

"میں تو یہ پروگرام دیکھوں گی۔" میری بیوی نے کہا۔

"بسم اللہ" کہتے ہوئے میں اپنی سٹڈی میں پہنچ گیا۔

باربرو کو دیکھتے ہی مجھے ناروبجن ہفت روزہ "خواب و خیال" کی وہ کہانی یاد آ گئی جو سچی کہانیوں کے ذیل میں شائع ہوئی تھی۔ اپنی روداد سنانے کیلئے باربرو نے معلوم نہیں ۱۹۹۵ کیوں منتخب کیا تھا۔ وہ رسالہ مجھے فوراً ہی مِل گیا۔ راوی کا کہنا تھا:

میں شمالی علاقے سے آئی ہوں۔ پہاڑوں کی بیٹی۔ میرا باپ ایک کسان ہے۔ دھرتی کا بیٹا۔ اُسے زمین سے محبت ہے۔ کاشتکاری کو وہ اپنا اظہار محبت کہا کرتا۔ میرا باپ میرا آئیڈیل تھا اور

فصل میری سہیلی۔ چشمے میرے ساتھی اور پہاڑ میرے دوست۔ وہاں بلند چوٹیوں کے دامن میں میرے باپ کے کھیت لہلہاتے تو وہ مجھے چومتا۔ میں بھی اپنے باپ کو پیار کرتی۔

میں سکول بھی جاتی تھی۔ نارویجن لازمی سکول کی تمام کلاسیں ختم ہونے تک میں وہاں جاتی رہی۔ آگے پڑھنے کے لئے مجھے شہر جانا تھا۔ میں نے اوسلو کے بارے میں سوچا۔ جب اپنے باپ کو میں نے اپنا خیال بتایا تو وہ بولا: "اوسلو ایک بڑا شہر ہے۔" -- اور وہ اداس ہو گیا۔

میں نے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس سے پوچھا "پاپا تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"مجھے نہیں ... تمہیں کچھ ہُوا ہے۔" اُس نے کہا۔ "تم جوان ہو گئی ہو۔ تم شہر جاؤگی۔ وہاں پر پہلے تم کسی سے پیار کروگی اور پھر اُس کے ساتھ بیاہ۔ شہر میں کسان نہیں رہتے۔ شہر کے لڑکوں کو کھیتوں میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں دھرتی کا بیٹا ہوں اور تم میری بیٹی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی کسان سے شادی کرو۔ وہ زمین سے پیار کرے تاکہ فصل تمہاری سہیلی رہے۔"

میں نے کہا "میں پڑھنے جا رہی ہوں۔ پیار کرنے نہیں۔ چشمے میرے ساتھی ہیں اور پہاڑ میرے دوست۔"

میرے باپ نے سر جھکا لیا اور بولا "ٹھیک ہے...! تم چلی جاؤ۔ مگر ہو گا وہی جو میں نے کہا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے اُسے الوداع کہا اور یہ سوچتے ہوئے اوسلو

چلی آئی کہ میرا باپ بوڑھا ہونے کو ہے۔ بڑھاپے کے خوف اُس پر طاری ہیں۔

میں اوسلو میں رہنے لگی تو مجھے ایک لڑکے سے پیار ہو گیا۔ مجھے شادی کا خیال آیا تو میں نے اپنے باپ کو لکھا۔ اُس کا جوابی خط ایک سطری سوال کی صورت میں تھا: "کیا وہ کسان ہے؟" ... لڑکا کسان نہیں تھا۔ میں اُس سے الگ ہو گئی۔

پھر مجھے ایک اور لڑکے سے پیار ہو گیا۔ وہ بھی مجھ سے سچ مچ کی محبت کرنے لگا۔ ہم اکٹھے رہنے لگے۔ اُسے پہاڑ پسند تھے۔ اُسے چشموں کا پانی میٹھا لگتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ وہ کاشتکاری کرے۔ میں نے اپنے باپ کو لکھا۔ اُس کا یک سطری جواب آیا: "لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔"

میرے باپ کا اندازہ شاید ٹھیک تھا۔ وہ کسان کی اولاد ہوتا یا کاشتکاری کا اُسے شوق ہوتا تو میرے باپ کی بات کا وہ اتنا بُرا نہیں مانتا کہ بغیر اطلاع دیئے ہی غائب ہو جاتا۔ میں پھر تنہا رہ گئی۔

تب مجھے وہ ملا جو کسان تھا۔ جس کے کھیت پہاڑوں کے دامن میں تھے۔ چشمے اُس کے ساتھی تھے اور پہاڑ اُس کے دوست۔ میں خوشی کے مارے جھوم گئی۔ وہ مجھے چومتے ہوئے کہتا "بوائی کیلئے زمین کو تیار کرنا میں جانتا ہوں۔" اُس کے ہاتھ مضبوط تھے اور چھاتی چوڑی۔ فصلیں کاٹ کاٹ کر اُس کا رنگ سنولایا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔

چھٹیوں میں ہم شمالی علاقہ میں گئے۔ پہاڑوں کے دامن میں

چشموں کے پاس۔ جہاں فصل میری سہیلی تھی۔ کھیت وہاں لہلہا رہے تھے جن کے بیچوں بیچ میرا باپ کھڑا تھا۔ میں اُس کی طرف بھاگی۔ میں چاہتی کہ اُسے پیار کروں اور میرا باپ مجھے چومے۔ اُس نے مجھے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ میں تو شاید نہ ہی رکتی لیکن میرے باپ کی زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے۔ میں ایک سٹومین کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ میرا باپ کہہ رہا تھا:

"یہ تو میں نے ضرور چاہا تھا کہ تم ایک کسان سے شادی کرو لیکن میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ تمہارے خاوند کے کھیت کوہِ ہمالیہ کے دامن میں ہوں۔"

اپنے باپ کے نسلی تعصّب کو باربَرو نے اچھے لفظوں میں چھپا لیا تھا۔

میں رسالہ لئے ڈرائینگ روم میں پہنچا تو ٹی وی پروگرام "ٹوٹے ہوئے رشتے" اپنے اختتام تک پہنچا ہُوا تھا۔ باربَرو اپنے باپ سے مِل رہی تھی۔ دونوں کے سامنے ہال میں بیٹھے ہوئے ناظرین تالیاں بجا رہے تھے اور میری بیوی اپنی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

"تم نے ایک اچھا پروگرام چھوڑ دیا۔" وہ بولی۔

"شاید؟" میں نے کہا "... لیکن باربَرو کی کہانی سے میں واقف ہوں۔"

"وہ کیسے؟" اُس نے پوچھا۔

"اس رسالے میں شائع ہوئی تھی۔" میں نے "خواب و خیال" کا پرچہ میز پر رکھا۔

"اچھا" وہ بولی "... لیکن پروگرام میں ایک کمی رہ گئی۔"

"وہ کیا؟؟" میں نے پوچھا۔

"ٹی وی والوں نے اُس کسان کو نہیں بلایا جس کے کھیت کوہِ ہمالیہ کے دامن میں تھے۔" میری بیوی نے بتایا۔

"کیسے بلاتے؟ — باربَرو کی اُس کسان سے علیحدگی ہو گئی تھی۔"

"ارے! یہ تو پروگرام میں انہوں نے بتایا ہی نہیں۔" میری بیوی بولی۔ "لیکن اُن میں علیحدگی کیوں ہو گئی؟"

"اس لئے کہ باربَرو کا خاوند کسان نہیں تھا۔" میں نے بتایا۔

"تو کیا اُس نے جھوٹ بولا تھا؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ حیران تھی۔

"کسی کے جھوٹ سچ کی وجہ میں کیا جانوں۔" میں نے وضاحت کی۔

اب اپنی بیوی کو میں کیا بتاتا، کہ جھوٹ میں نے کیوں بولا تھا۔

Prof. SHARIB RUDAULVI COLLECTION

دھوپ کی وسعت

بادلوں سے باہر نکلتے ہی ہوائی جہاز کو نرم دھوپ کی وسعت نے گرفت میں لے لیا۔ لندن کا مٹیالا منظر کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ جہاز کے اندرونی منظر میں جو رنگ دھند اور بارش کی وجہ سے پھیکے معلوم ہو رہے تھے اب اپنی شوخی کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ نیچے سفید روئی کا پھیلا پھولا فرش تھا اور اوپر نیلگوں پھیلاؤ لئے آسمانی سائبان۔ فضائی میزبانوں کو متحرک دیکھ کر مسافروں نے اپنی فولڈ میزیں کھول لیں۔ خاطر تواضع کی ٹرالی ابھی دور تھی۔ شاکر نے سلیمہ کا خط نکال لیا۔

آپ اوسلو آ جائیں۔ اس کاغذ کے اوپر بائیں کونے میں لکھے ہوئے نمبر پر آپ ٹریول ایجینٹ کو فون کریں۔ پہلے اپنا نام بتائیں پھر ہماری فرم کا "ساجد ٹریڈرز"۔ جس دن کی جو فلائیٹ سوٹ کرتی ہو آپ ان کو بتا دیں۔ ٹکٹ آپ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ خرچہ صرف آنے جانے کے اخراجات کا نہیں ہوتا۔ وقت بھی ایک سرمایہ ہے لیکن اس کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟ — اللہ کے نام پر اپنے دوست کے پریشان خاندان کی مدد کریں۔ آپ کے ایک آدھ ویک اینڈ کی قربانی سے ہمارے گھر کو نئی زندگی مل جائے گی۔ یہاں کے

مسائل کا اندازہ آپ کو ان کاغذات سے ہو جائے گا جو اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ یہ سب کچھ ساجد نے لکھا ہے۔ فوٹو سٹیٹ کاپیاں میں نے بنائی ہیں۔ ان کو آپ ضرور پڑھ لیں۔

مجھے پاکستانی سٹائل کا عشق ہو گیا ہے۔ ساجد نے لکھا تھا۔ بیس سال کے بعد میں اس عفریت کے قابو میں آیا ہوں۔ لاہور میں جب مجھے عشق ہوتا تو تصوّر میں ایک مکالمہ جاری ہو جاتا۔ دوست احباب اسے میری خود کلامی کا زمانہ بیان کرتے۔ تنہائی میسّر آتے ہی میں خطوط لکھنے شروع کر دیتا لیکن انہیں مکمل نہیں کر پاتا۔ ملاقات کے پروگرام بناتا اور ملتوی کر دیتا۔ خامیاں منصوبہ بندی میں رہ جاتیں اور الزام میں حالات کے جبر پر عائد کر دیتا۔ میں خوش رہنے کی کوشش میں اداس رہتا۔

ایسے زمانے میں ٹائم کلنگ کا میں بادشاہ ہوتا۔ مصروفیات ہاتھ باندھے میری منتظر رہتیں اور میں عشق کے تصوّر میں گم۔ آہستہ آہستہ روز مرّہ زندگی کا نظام بگڑنے لگتا۔ قرض بڑھ جاتا، نیند اُڑ جاتی اور سُرور کی ضرورت بڑھ جاتی۔ چسکے اور سواد کی لپیٹ میں رہنا مجھے اچھا لگتا۔ نبض کی رفتار تیز ہو جاتی۔ کسی بیماری کے جراثیم پیش قدمی شروع کر دیتے۔ بس یہی وہ دور ہوتا جب کسی کھڑکی سے ہوا کا ایک آدھ جھونکا چلا آتا۔ کوئی آئینہ بے نقاب ہو جاتا۔ میری بصارت مجھے واپس مل جاتی اور میرا تصوّر کینچلی بدل لیتا۔ خود کلامی کا زمانہ ختم ہو جاتا اور نبض کی رفتار نارمل ہو جاتی۔

اوسلو پہنچ کر معلوم ہوا کہ عشق کسی سحر کا نام نہیں بلکہ روزمرّہ زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ بدن چونکہ مستور نہیں اس لئے محبت کرنا تصوّر تک محدود نہیں۔ ناروے کی گلیوں اور بازاروں میں جسم ایک دوسرے کو کھلی باہوں سے اپناتے نظر آئے۔ استقبالی معانقے اور الوداعی بوسے صرف ہوائی اڈّے اور ریلوے سٹیشن تک محدود نہیں تھے۔ کلب، کیفے اور فٹ پاتھ تک پر جدائی اور ملاپ کے مناظر عام تھے۔ لڑکیوں کے گلے میں دل کی شکل کے لاکٹ نظر آتے اور لڑکوں کے لب سچ مچ کے مکالمے میں مصروف۔ یہ مکالمہ جنس مخالف کے لبوں میں مدغم ہو کر جاری ہوتا۔ معلوم ہوتا تھا خود کلامی کی عادت کسی کو نہیں رہ گئی۔

"پینے کے لئے آپ کیا پسند کریں گے؟" مسکراتی ایرہوسٹس نے ٹرالی روک کر پوچھا۔

"ریڈوائن!" اوسلو کے برفانی موسم نے تقاضہ کیا۔

"بہت بہتر!" فرمائش پوری کرنے کے بعد ٹرالی آگے بڑھ گئی۔

ان دنوں میں گیند کی طرح ٹپّے کھا رہا ہوں۔ ساجد نے دوسرے کاغذ پر لکھا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ گیند کی حرکت عمودی ہوتی ہے اور میرا ہلنا جلنا افقی۔ گیند زمین سے دور و نزدیک ہوتی رہتی ہے اور میں انسانوں سے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کسی کے قریب کیوں ہوتا ہوں اور دور ہونے کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔ زندگی میں یہ ایک نئی

صورت حال ہے۔ لاہور میں ہوتا تو کسی یار دوست سے ڈسکس کر لیتا۔ یہاں پر تو کوئی یار دوست بھی نہیں ہے۔ کئی دفعہ کوشش کی کہ اپنا مسئلہ خط میں لکھ بھیجوں۔ شاید کوئی مشورہ مِل جائے لیکن یہاں پر تنہائی میسّر ہونے کے باوجود خط نہیں لکھا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے سارے رابطے کمزور ہو گئے ہیں۔ بچپن میں انگلیوں کے پٹاخے نکالنا بہت اچھا لگتا تھا۔ بزرگ کہتے تھے ایسا کرنے سے جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں۔ پردیس کی زندگی میں پٹاخہ سنائی بھی نہیں دیتا اور انسان کے جوڑ کمزور ہو جاتے ہیں۔

زاہدہ کیلئے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کے لئے ملنا اور بچھڑ جانا زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ زندگی اور موت کو بھی وہ اسی تناظر میں دیکھتی ہے۔ پیدائش کے موقع پر منائی جانے والی خوشی اور مرگ کے سوگ کو وہ حقیقی جذبات کا اظہار کہتی ہے۔ سچّے دل سے ملنے اور بچھڑ جانے والوں کو دیکھ کر اسے بہت تسکین ملتی ہے۔ جب کبھی اداس ہوتی ہے تو وہ ایرپورٹ پر چلی جاتی ہے۔ آمد یا روانگی کے لئے مخصوص حصّے میں پہنچ کر آنے یا جانے والے مسافروں کو دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی بچھڑنے والوں کو دیکھ کر آنسو بہاتی ہے تو کبھی مل جانے والوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

"کھانا!" فضائی مہربان ٹرے اٹھائے بغل میں کھڑی تھی۔

شاکر نے کاغذات سمیٹ کر کھانے کی ٹرے کے لئے جگہ بنائی۔

بن، پنیر، مکھن، سلاد، بیف اور سبزی کی خوشبو اشتہا انگیز تھی۔

کیک کھانے کی باری آئی تو فضائی میزبان پھر بغل میں کھڑی تھی،
"چائے یا کافی۔"

کھانے پینے سے فارغ ہو کر جب مسافر اپنے سامنے کی میزیں فولڈ کرنے لگے تو شاکر نے ساجد کا لکھا ہوا آخری کاغذ نکال لیا۔ اس نے لکھا تھا: دوستیاں پودوں کی مانند ہوتی ہیں۔ انہیں پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ ان کے لئے کھاد اور پانی کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ جب سے مجھے یہ بات سمجھ میں آئی ہے میں ذرا متحرک ہو گیا ہوں۔ جن لوگوں سے مل کر مجھے خوشی ہوتی ہے ان کے سگنلز کیلئے میں اپنے "اینٹینے" سے پوچھ گچھ کرتا رہتا ہوں۔ ہماری بعض رگیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر باقاعدگی سے ان کی مالش نہ کی جائے تو وہ صحیح طور پر کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔

"کیا میری ساری رگیں صحیح طور پر کام کرتی ہیں؟" سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے شاکر نے سوچا۔

غنودگی کا غلبہ ہونے لگا تو شاکر نے آنکھیں بند کر لیں۔ سامنے گھپ اندھیرا تھا اور اطراف میں ڈراؤنی آوازیں۔ اس کا بدن ایک سوکھے پتے کی طرح ان دیکھی ہواؤں کے زور سے ایک انجانی سمت میں بہت تیز رفتاری کے ساتھ اڑتا چلا جا رہا تھا۔ دور ایک ٹمٹماتا ہوا ستارہ نظر آیا جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے ساتھ ایک کہکشاں بھی نمایاں ہونے لگی۔ پھر ستارہ ایک جگہ پر ساکت ہو گیا۔ ٹمٹمانے کی بجائے اب وہ راستہ دکھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اپنی سمت کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ وہ قطبی ستارہ تھا۔ اس کے نقش اب واضح ہو رہے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب صاف نظر آنے لگا تھا۔

شاکر نے اسے پہچان لیا۔ کہکشاں کے ساتھ ساجد کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ تھے۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنا رہا ہے۔ ڈراؤنی آوازیں پیدا کرنے والے دم دار ستارے گردش کرتے ہوئے اب کہیں دور جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہکشاں نے اب ایک واضح دودھیا راستے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ساری فضا ایک سٹیڈیم کی تھی جو روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ لاتعداد لوگوں سے بھرا ہوا۔ سب داد دے رہے تھے۔ یکدم ایک سیٹی بجی۔ سب لوگ سہم گئے۔ فضا میں بڑبڑاہٹ کی آوازیں رہ گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ بھی معدوم ہو گئیں۔ مکمل خاموشی نے شاکر کے حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ٹن کی گونج کے ساتھ ہی ہدایات کی بتیاں جل اٹھیں۔

سب مسافروں نے اپنی اپنی پیٹیاں سنبھال لیں اور ٹک، ٹکا ٹک کی آوازیں پورے جہاز میں پھیل گئیں۔ لینڈنگ سے پہلے سمیٹی جانے والی چیزوں کو سنبھالنے کے لئے فضائی میزبانوں کی رفتار میں تیزی سی آ گئی۔

اوسلو ایرپورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر پار کر کے شاکر باہر نکلا تو اُسے سلیمہ نظر آ گئی۔ وہ اکیلی کھڑی تھی۔

"آپ کے مجازی خدا؟" شاکر نے پوچھا۔

"اپنی دیوی کے ہاں!" سلیمہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کڑواہٹ تھی۔

"ساجد کو میرے آنے کی خبر ہے؟"

"بالکل ہے!"

"کمال ہے۔" شاکر بڑبڑایا۔ "تمہیں اکیلے آنا پڑا۔"

"میں اکیلی اب بہت کچھ کر لیتی ہوں۔" مسکراتے ہوئے سلیمہ بولی۔

ایرپورٹ سے گھر تک کے منظر نے شاکر کو ٹھٹھرا دیا۔ کار کے اندر خنکی نہیں تھی لیکن باہر سب کچھ برف پوش تھا۔ سڑک، فٹ پاتھ اور چھتیں۔ تھوڑے بہت لوگ جو اسے نظر آئے وہ سبھی کچھ ایسا لباس پہنے تھے گویا خلا باز ہوں۔ بھاری جوتے، موٹی جیکٹیں، اونی ٹوپیاں اور گرم مفلر۔ خود کو گرم رکھنے کے لئے معلوم ہوتا تھا سب نے پیٹ میں آگ جلا رکھی ہے۔ ہر ایک کے منہ سے دھواں نکلتا تھا۔

گھر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ڈرائینگ روم کا آتش دان روشن کیا جا رہا تھا۔ کھٹکا سن کر ساجد نے مڑ کر دیکھا۔ شاکر کو دیکھ کر وہ آگے بڑھا تو دونوں بغلگیر ہو گئے۔

"کیوں شہزادے؟" شاکر بولا "ایرپورٹ پر کیوں نہیں آئے۔"

"میں نے سوچا..." معمولی وقفے کے بعد ساجد نے کہا "مہمان کو میزبان ہی گھر لائے تو بہتر ہے۔"

"تم میرے میزبان نہیں ہو؟"

"نہیں!" ساجد کی آنکھوں میں شرارت چمکی "میں تمہارا دوست ہوں۔ بس!"

شام کے کھانے کے بعد گھر کے دونوں بچے اپنی اپنی مصروفیات کے سلسلہ میں گھر سے باہر چلے گئے۔ بیٹے کو باسکٹ بال کھیلنا تھا اور بیٹی کو وائلن کی مشق کے لئے جانا تھا۔ شاکر اور ساجد ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تو سلیمہ نے میز پر خشک میوے سجا دیئے۔

"تمہارے لندن پہنچنے کا سن کر سلیمہ تو بے چین ہو گئی تھی۔" ساجد نے بتایا "مجھے کہنے لگی تمہارے بچپن کا دوست ہے۔ اسے ناروے بلاؤ۔"

"پھر بلایا کیوں نہیں تم نے؟" شاکر نے پوچھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ یہ خود تمہیں بلا لے گی۔" ساجد نے بتایا۔

"اچھا تو تبھی تم نے نامکمل خطوط لکھنے شروع کر دیئے؟"

"کیا مطلب؟؟؟" کئی رنگ ساجد کے چہرے پر آ کر گزر گئے۔

"نامعلوم مخاطب کے نام لکھے تمہارے رقعوں کی فوٹو کاپیاں سلیمہ نے مجھے بھیج دی تھیں۔" شاکر نے اپنی جیب سے کاغذات باہر نکال لئے۔

زہریلی آنکھوں سے ساجد نے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

"یم نے لکھا تھا: مصروفیات ہاتھ باندھے میری منتظر رہتیں اور میں عشق کے تصوّر میں گم۔" شاکر نے اسے یاد دلایا۔

"... روزمرہ زندگی کا نظام بگڑنے لگتا اور قرض بڑھ جاتا۔ ... جو کچھ میں نے لکھا تھا — مجھے سب یاد ہے" ساجد غصّے سے بولا "... نیند اڑ جاتی اور سرور کی ضرورت بڑھ جاتی — لیکن یہ سب لاہور میں ہوتا تھا اور ہو سکتا تھا۔" پھر چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے اس نے کہا

"تب میں کنوارہ تھا، اب دو بچوں کا باپ ہوں جو لگ بھگ بالغ ہیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ہر کام کو اپنے وقت پر نپٹانا پڑتا ہے۔ پھر یہ خود بھی تو ہے۔ اگر میں کوئی کام بھول جاؤں تو یہ کر دیتی ہے۔ کاروبار میں برابر کی حصّہ وار ہے یہ۔ اس سے پوچھو کہ میں نے کب اور کہاں غیرذمہ داری کا ثبوت دیا؟"

"بھئی بیوی ہے۔" شاکر ایک گداز لہجے میں بولا "خاوند کے عشق سے پریشان تو ہوگی۔"

"میں اپنے خاندان کو بچانا چاہتی ہوں" اب سلیمہ بھی بولی۔

"خاندان کو کیا خطرہ ہے؟" بکّے بکّے ساجد نے سلیمہ کی طرف دیکھا۔

"زاہدہ!" سلیمہ پورے دم خم سے بولی۔

"بعض اوقات تم حد کر دیتی ہو سلیمہ۔" خودکلامی کے انداز میں ساجد نے کہا۔

"یہ زاہدہ کون ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"میری سکرٹری ہے یار!" کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے ساجد نے بتایا۔

"یعنی سارا دن تمہارے ساتھ رہتی ہے؟" شاکر نے پوچھا۔

"نہیں!" ساجد بولا "وہ سارا دن ہمارے ساتھ رہتی ہے۔ سلیمہ اور میں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

پھر بچّے گھر آ گئے۔

شاکر کے لئے وہ بچّے عجیب بچّے تھے۔ انہوں نے اپنے دادا، دادی

کے کسی قصّے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اپنے باپ کے بچپن کا کوئی واقعہ ان کی آنکھوں میں چمک نہ پیدا کر سکا۔ شاکر نے سوچا کہ بچّوں کو اس کی زبان سمجھنے میں دشواری ہو سکتی ہے چنانچہ اس نے چاہا کہ وہی کوئی بات سنائیں۔ ایسی بات جس پر انہیں فخر ہو۔ کوئی ایسا واقعہ جو ان کے لئے غیر معمولی ہو لیکن ان کا رویّہ کم وولٹیج کے بلب کا ہی رہا۔ ان کے دل و دماغ کی پوری کارکردگی شاکر کو نظر نہ آ سکی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچّوں کو اپنے والدین کے وطن یا ہم وطن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ شاکر نے چاہا کہ بچّے اپنے وطن یا ہم وطنوں کے بارے میں ہی اسے کچھ بتائیں لیکن اس باب میں بھی ان کا رویّہ ٹھنڈا رہا۔ سلیمہ کا خیال تھا کہ دن بھر کی مصروفیت نے بچّوں کو بس تھکا دیا تھا ورنہ بچے ہوئے وہ نہیں تھے۔

"زاہدہ کی ایک بات کا میں بہت مداح ہوں۔" ناشتے کے بعد ساجد نے بتایا۔ "وہ کھل کر ہنس لیتی ہے اور جی بھر کر رو لیتی ہے۔"

"اس بات کو کون خوبی سمجھے گا؟" شاکر کی طرف دیکھتے ہوئے سلیمہ نے پوچھا۔

"ہر وہ فرد جو کھل کر رونے اور ہنسنے کی افادیت سے آگاہ ہوگا۔" ساجد نے کہا، "مجھے کھل کر ہنسے معلوم نہیں کتنے سال ہو گئے ہیں؟ — رونے رلانے کا شعبہ تو تمہارے پاس ہوتا تھا سلیمہ —" ساجد نے اس کی طرف دیکھا "ذرا ٹھیک ٹھیک بتانا کہ سچ مچ روئے ہوئے تمہیں کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"میں کیوں روؤں گی؟" سر اٹھا کر سلیمہ نے جواب دیا۔

"میرے لئے تو ممکن نہیں کہ کہہ دوں --- میں کیوں ہنسوں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" شاکر نے پوچھا۔

"صرف یہ کہ ہنسنے رونے کا انحصار بھی ایک سرمائے پر ہوتا ہے۔ محبت کے سرمائے میں اضافہ ہو جائے تو ہم ہنستے ہیں اور کم ہو جانے پر ہم روتے ہیں۔" ساجد نے وضاحت کی۔

"بات کچھ واضح نہیں ہو سکی۔" شاکر نے بتایا۔

"میرے اور سلیمہ کے پاس اب کاروبار کے کھاتے رہ گئے ہیں۔ محبت کے اکاؤنٹ بند ہو چکے ہیں۔" ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ساجد نے کہا۔ "تمہارے پاس کریڈٹ کارڈ ہوگا۔ کسی بھی کاؤنٹر پر دو --- ادائیگی ہو جائے گی۔ جانتے ہو کیوں؟" ساجد نے پوچھا۔

"کیوں؟" شاکر نے کہا۔

"وہ اس لئے کہ متعلقہ کارندے کو خبر ہے کہ کریڈٹ کارڈ ایک سرمائے کا ٹوکن ہے۔ ادائیگی کا زر تبادلہ قابل حصول ہے۔ کھل کر رونا ہنسنا انہیں کو میسّر ہے جن کے پاس جذبات کا کریڈٹ کارڈ ہے۔ ان کی محبت کے سرمائے میں اضافہ ہو جائے تو وہ ہنس لیتے ہیں۔ اگر کمی ہو جائے تو رو لیتے ہیں۔" ساجد نے وضاحت کی۔

"تمہارا مطلب ہے ..." سلیمہ نے ساجد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا، "زاہدہ کے پاس محبت کا سرمایہ موجود ہے؟"

"یقیناً!" ساجد اٹھتے ہوئے بولا "آج ہفتے کا دن ہے۔ پروگرام کے مطابق مجھے بچّوں کو شاپنگ کرانی ہے۔ تم دونوں زاہدہ کا یہ نامکمل خط پڑھ لو۔" اس نے بٹوے سے ایک کاغذ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے

کہا "ہو سکتا ہے میری دلچسپی کی وجہ تم سمجھ جاؤ۔ مخاطب اس کا بھی نامعلوم ہے۔"

زاہدہ نے لکھا تھا: ٹورسٹ اور پرندے ناروے سے جا چکے ہیں۔ پرندے دانے پانی کے لئے گرم ساحلوں اور سرسبز کھیتوں کی طرف پرواز کر گئے ہیں تو ٹورسٹوں کی چھٹیاں اور ٹریولرچیک ختم ہو گئے ہیں۔ کاش میں بھی پرندہ ہوتی یا ٹورسٹ۔

گئے سالوں کی طرح اس برس بھی نارویجن درختوں کے پتّے دنوں میں زرد ہوئے اور ہفتہ بھر میں سڑکوں پر بکھر گئے۔ ایک روز تیز ہوا گہرے بادل لائی تو بارش شروع ہوگئی۔ پھر درجہ حرارت گرنے لگا۔ پہلی برف باری نے اوسلو کو سردیوں کا گیٹ اپ دے دیا۔ گلیاں، بازار، مکان اور دوکانوں کی چھتیں، ٹیلے اور پہاڑ سبھی کچھ برف سے ڈھک گیا۔ میں نے بند گلے کی بھاری جیکٹ پہن کر کانوں کے گرد اونی مفلر لپیٹ لیا ہے۔ موٹی دستانوں سے ہاتھوں اور گرم ٹوپی سے سر کو ڈھانپ لیا ہے۔ دن سکڑ گئے ہیں۔ اجالے میں کمی ہو گئی ہے۔ انسانوں کے منہ سے نکلنے والی بھاپ، سردیوں کی کہر اور بادلوں کے غلاف نے شہر کی روشنیوں کو دھندلا کر دیا ہے۔ منظر پھیکے پڑ گئے ہیں اور راتیں طویل ہو گئی ہیں۔

بڑھتی ہوئی سردی کے اس منظر سے انسان تقریباً غائب ہو گئے ہیں۔ برف کی تہوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کھانے کے علاوہ مچھلی کا تیل اور سبزیوں کا سوپ بھی باقاعدگی سے پی رہی ہوں لیکن حرارت کے لئے کچھ اور بھی چاہیئے۔ باہر کی ٹھنڈ کا مقابلہ کرنے کے لئے لوگ

اپنے اندر جھانکتے ہیں۔ میرے اندر کیا ہے؟ میں کسے دیکھوں؟

"بیوہ ہے؟" شاکر نے سلیمہ سے پوچھا۔

"نہیں!" سلیمہ نے جواب دیا۔ "مطلقہ ہے۔ بچّہ کوئی نہیں۔"

"ایک درخواست ہے۔" اتوار کی صبح شاکر نے ساجد سے کہا۔

"تم حکم کرو!" ساجد چہکا۔

"جانے سے پہلے میں زاہدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"نو پرابلم۔" ساجد بولا "میں ٹیلی فون کر دوں پھر نکلتے ہیں۔"

"بغیر ٹیلی فون کے چلتے ہیں۔" شاکر نے اصرار کیا۔

"ایسا کرنا خلاف تہذیب ہوگا۔" ساجد نے بتایا "وہ اکیلی رہتی ہے۔ جانے کس حال میں ہو۔ اس کی کیفیت کیا ہو۔ پھر وہ عورت ذات اور ہم دو مرد حضرات۔"

"سلیمہ ساتھ چلے گی۔" شاکر نے اطلاع دی۔

"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا۔" ساجد تذبذب میں تھا۔

"دل کو منا لو یار!" شاکر نے کہا "پاکستان میں ہم بغیر اطلاع دیئے سب طرف چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ سبھی موسموں میں دوسروں کی کیفیت سے آگاہ رہتے ہیں۔ ضرورت میں ہم کام بھی آتے ہیں۔ زاہدہ ایک تنہا، اداس عورت ہے۔ جی چاہتا ہے سلیمہ اور میں خود اپنی آنکھوں سے اسے اپنے ٹھکانے پر دیکھ لیں کہ وہ کتنی تنہا ہے اور کس

قدر اداس۔"

تینوں وہاں پہنچے تو زاہدہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ زاروقطار روتی رہی ہے۔

"کیا ہوا؟" ساجد نے پوچھا۔

زاہدہ نے ایک کاغذ لہرایا۔

"ایک نامکمل خط؟" شاکر نے اندازہ لگایا۔

"مخاطب نامعلوم؟" خط تھامتے ہوئے ساجد بولا۔

"کس نے لکھا ہے؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"میری ماں نے۔" زاہدہ نے جواب دیا۔ "جب سے میں یہاں آئی ہوں وہ پاکستان میں اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کی تنہائی نامکمل خطوط بانٹتے ہیں۔ کبھی کبھار ہماری ہمسائی ایک آدھ تحریر مجھے بھیج دیتی ہے۔"

پوری پوری رات جاگتی ہوں۔ زاہدہ کی ماں نے لکھا تھا۔ آنکھیں بند کروں تو ٹک ٹک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ معلوم نہیں ہو پاتا دل دھڑکتا ہے کہ گھڑی چلتی ہے۔ کبھی کبھار تو میں اٹھ کر غسل خانے میں جھانکتی ہوں۔ شاید پانی کی ٹوٹنی ڈھیلی رہ گئی ہو اور ٹپ ٹپ کی آواز جست کی خالی بالٹی میں ٹپکتے قطروں کی وجہ سے ہو۔ آنکھیں بند ہوں تو ٹک ٹک اور ٹپ ٹپ کے فرق کا کیا پتہ چلتا ہے؟ آنکھیں کھولتی ہوں تو رات کی خاموشی کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے حواس میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ آنکھوں سے میں سنتی ہوں اور کانوں سے میں دیکھتی ہوں۔ لیکن ایسا صرف رات کے

وقت ہوتا ہے۔ دن میں حواس ٹھیک کام کرتے ہیں۔ دائیں بائیں کی خوشبو کا پتہ چلتا ہے۔ پاس پڑوس کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ زبان ذائقے کی گواہی دیتی ہے۔ آئینے میں سراپا دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھ سردی گرمی کے بھید بھاؤ سے آگاہ رکھتے ہیں۔ معلوم نہیں زاہدہ کے دن رات کیسے گزرتے ہیں۔

سلیمہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دیکھا تم نے؟" ساجد نے کہا "زاہدہ کے پاس محبت کا سرمایہ موجود ہے۔ اس کی ماں اس کا سرمایہ ہے۔"

"سب کے لئے ماں ایک سرمایہ ہے۔" شاکر نے کہا۔

"محبت ایک سرمایہ ہے۔" ساجد زور دے کر بولا۔ "پردیس کی زندگی نے ہماری محبت کے جوڑ کمزور کر دیئے ہیں۔ رشتوں کے پٹاخے اب بھیگ چکے ہیں۔ تم وطن میں رہتے ہو۔ تمہارے جذبوں کا بارود ابھی سلامت ہے۔"

"تمہارے الفاظ میرے لئے قطبی ستارے کی طرح چمکتے رہیں گے۔" شاکر نے کہا۔

"چلیں؟" سلیمہ نے پوچھا۔

"چلو" ساجد نے جواب دیا۔

"دیکھو! ساجد عجیب آدمی ہے۔" ایر پورٹ پر سلیمہ نے کہا "نہ تو تمہیں لینے آیا تھا اور نہ اب چھوڑنے کیلئے۔"

"میرا خیال ہے اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔" سلیمہ

کے ہاتھ تھامتے ہوئے شاکر بولا۔ "وہ ہمیں وقت دینا چاہتا تھا"

"تمہارا مطلب ہے... اسے..."

"اسے ہمیشہ سے پتہ تھا سلیمہ" شاکر نے اس کی بات کاٹی۔

برف کی مانند ٹھنڈی سلیمہ کی نظریں شاکر کی آنکھوں میں جم کر رہ گئیں۔

"کالج کے زمانے میں تم کہا کرتی تھیں..." شاکر بولا "جب کبھی میرے بس میں ہوا، اپنے بھدّے اور کھردرے ہاتھوں کو بدل ڈالوں گی — یاد ہے؟"

سلیمہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ساجد نے ان کو بدل ڈالا ہے۔" کہتے ہوئے شاکر روانگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فضا میں چڑھتے اترتے جہازوں کا شور رچا ہوا تھا۔

بے حساب — با حساب

بے حساب

اُترنے والے مسافروں نے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں لیکن میری بغل والا مسافر نہیں اٹھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی رہا۔ لندن ایرپورٹ پر اس کے عربی لباس کی وجہ سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کا ساتھ بس دبئی تک رہے گا۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ میرے اور پی آئی اے کے جہاز کی طرح اس کی منزل بھی کراچی ہی تھی۔

پورے سفر میں وہ تسبیح گھماتا رہا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کے وہ دانہ پھینکتا اور پھونکیں مارتا۔ پہلے اپنے دائیں اور پھر اپنے بائیں طرف۔ تسبیح کے دانے ختم ہو جانے پر وہ فضائی میزبان کو بلانے والا بٹن دبا دیتا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

"یس پلیز؟" ایرہوسٹس آ کر کہتی۔

"کوکا کولا!" شہادت کی انگلی اٹھا کر وہ بولتا۔

تین راؤنڈ کے بعد مجھے کوفت ہونے لگی۔ اس کی پھونکوں کا ہدف تو شاید اس کے کندھے تھے لیکن ان کی وجہ سے میرے اعصاب جواب دینے لگے۔

دبئی ابھی بہت دور تھا اس لئے کوئی خالی سیٹ دیکھنے کیلئے میں

اٹھ کھڑا ہوا۔

جہاز کی پچھلی سیٹوں پر جگہ موجود تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ جب دبئی پہنچنے کا اعلان ہوا تو اپنی اصلی سیٹ پر میں واپس آگیا۔ میرا خیال تھا اب کراچی تک کا باقی سفر ہمسائے کی پھونکوں کے بغیر گزرے گا۔

اترنے والے مسافروں نے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں لیکن میری بغل میں بیٹھا مسافر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی رہا۔ دبئی سے سوار ہونے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سیٹ بدلنے کے بارے میں سوچنا بھی مشکل تھا۔ مجبوراً میں وہیں بیٹھا رہا۔

جہاز نے اڑان بھر لی تو فضائی میزبان نے مسافروں میں وہ فارم/ کارڈ تقسیم کر دیئے جو ایرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر پاسپورٹ کے ساتھ سبھی لوگوں نے جمع کرانے تھے۔ اکثر مسافر انہیں پُر کرنے لگے۔ میں نے بھی قلم نکال لیا۔

نام، پتہ اور پاسپورٹ نمبر وغیرہ لکھنے کے بعد فارم کے آخری خانے میں تاریخ لکھ کر میں نے دستخط کئے اور پین بند کر دیا۔ اُسی وقت میرے ہمسائے ... عربی مسافر نے اپنا کارڈ/فارم میرے سامنے رکھ دیا۔

"اسے بھی بھر دیں۔" وہ اردو میں بولا۔

"ارے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "آپ اردو بول سکتے ہیں؟"

"ہاں!" اس نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں پاکستانی ہوں۔" پھر اس نے اپنا پاسپورٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بس لکھنا پڑھنا نہیں آتا۔"

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ راستے میں کوئی ایرپاکٹ آ گئی تھی۔

"عربی لباس آپ کو پسند ہے؟" فارم پُر کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

"پسند ہی سمجھ لیں۔" میرے ہمسائے نے جواب دیا۔ "سفر کرتے وقت میں اسے پہن لیتا ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرح مجھے فائدہ رہتا ہے۔"

"کیا؟"

"ایرہوسٹس ڈانٹنے کی بجائے خدمت کرتی ہے۔"

"خدمت؟ — واقعی ؟؟" مجھے اس کی بات پر کچھ یقین نہیں آیا۔

"ہاں— ! واقعی خدمت " وہ وثوق سے بولا۔ "عربی چولا پہنا ہو تو کوکاکولا بے حساب ملتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے فضائی میزبان کو بلانے والا بٹن دبایا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

با حساب

میری طرف دیکھئے— ! ہاں! اب ذرا مسکرائیے... ! شکریہ!!

چلئے تصویر والا کام تو ہُوا۔ اب اپنے بائیوڈیٹا کی کاپی آپ نے مجھے مہیا کرنی ہے۔ پاکستان میں کسی ذہین طالب علم سے —جس کو

افسانے سے لگاؤ ہوگا۔ ہم آپ پر تھیسیئس لکھوائیں گے۔ جس کالج کے طلباء کو میں پڑھاتا ہوں وہاں پر ایم اے کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمینٹ کے بعد میں ہی سینئر استاد ہوں۔ ہم مِل کر ہی اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ طلباء کون سے ادیبوں پر کام کریں گے۔ جس زندہ ادیب پر تھیسیئس لکھا جانا ہو اس کی عمر کا ساٹھ سال سے زیادہ ہونا ضروری ہے۔ یہاں یورپ میں جو دو چار ادیب اس شرط کو پورا کرتے ہیں آپ ان میں سے ایک ہیں۔ پھر آپ نے محنت بہت کی ہے۔ اب اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو صرف ایک تکلیف کرنا ہوگی۔ اپنی تخلیقات کی ایک فہرست بنانا پڑے گی۔ اُن کو اکھٹا کرنے اور پڑھنے پڑھوانے کا کام ہم خود کروالیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ پر کام میری نگرانی میں ہو تاکہ ادیب کی حیثیت سے آپ کے صحیح مقام کا تعیّن کیا جا سکے۔

آپ کو یاد ہی ہوگا کہ جب آپ پاکستان تشریف لائے تھے تو کھانے کیلئے کسی ریستوران میں جانے کی بجائے میں آپ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہاں پر آپ سے جو گفتگو رہی تھی اُسے انٹرویو کی صورت میں شہر کے معروف اخبار کے ادبی صفحے پر خوب نمایاں کر کے شائع کروا دیا تھا۔ اِن دنوں ایک انگریزی اخبار کا ادبی صفحہ میرے پاس ہے۔ آپ کی تازہ ترین تخلیقات اور موجودہ خیالات کو میں اس اخبار میں شائع کراؤں گا۔ ساتھ میں آپ کی یہ تصویر ہوگی جو اس وقت میرے کیمرے میں محفوظ ہے۔

جی چاہتا ہے کسی روز میں آپ کی کتابیں دیکھوں۔ آپ گھر میں

جس جگہ پر بیٹھ کر پڑھنے لکھنے کا کام کرتے ہیں اُس کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی شخصیت کے تخلیقی رُخ کو میں اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا سکوں۔ اس طرح وہ مضمون جو میں انگریزی زبان میں لکھوں گا وہ آپ کی شخصیت کا ایک بھرپور تاثّر پیدا کرے گا۔ آپ چاہیں تو اس مضمون کو یہاں مغرب کے اپنے دوستوں کو دکھائیں۔ وہاں لاہور میں تو یہ اس طالب علم کے لئے بہت کارآمد ہوگا جو اپنے ایم اے کی ڈگری کیلئے آپ کی آفسانہ نگاری پر تھیسیئس لکھے گا۔

یہاں آپ کے شہر میں ایک دو دن کیلئے تو میرے موجودہ میزبانوں نے میری کچھ مصروفیات طے کر رکھی ہیں۔ قیام و طعام کا بندوبست چونکہ انہیں کا ہے اس لئے ان کی دی ہوئی ذمہ داریاں تو مجھے نبھانا ہی پڑیں گی لیکن اس کے بعد میں فارغ ہوں۔ آپ کے ہاں میں پرسوں سے آ سکوں گا۔ کیا کہتے ہیں آپ؟

دالان کی دھوپ

"کیتھرینا چلی گئی ... ؟؟" یونس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔
دن رات جلنے والا لیمپ بجھا ہوا تھا۔
جب کیتھرینا یونس کے فلیٹ میں شِفٹ ہوئی تو ڈرائینگ روم کے دائیں کونے کے بارے میں اُس نے کہا "یہ میرا ہے۔" پھر وہاں پر ایک لیمپ جلا کر وہ بولی "اسے کبھی بجھانا نہیں۔ یہ دن رات جلے گا۔ جس دن تمہیں یہ بجھا ہُوا ملے، سمجھ جانا میں چلی گئی۔ تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔"

یونس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ چھنگلی کے ساتھ والی انگلی میں وہ انگوٹھی موجود تھی جو اس جدائی کا سبّب تھی۔

تین ہفتے پہلے کیتھرینا اپنے گاؤں گئی تو اگلے روز یونس بیمار ہو گیا۔ شام کے وقت طبعیت زیادہ خراب ہو گئی تو اس نے اپنے ایجنٹ زیرو زیرو سیون کو فون کر دیا۔ جمشید اس کیلئے جیمز بانڈ کی مانند تھا۔ اس کے تمام مسائل حل کرنے کے لئے ہر وقت تیار۔ وہ فوراً یونس کے پاس آن پہنچا۔ مریض کی حالت دیکھ کر اس نے میڈیکل کی ایمرجنسی ایڈ کیلئے ٹیلی فون کر دیا۔ ڈاکٹر نے آ کر بتایا کہ خطرے کی کوئی بات

نہیں۔ پورا شہر ایک وائرس کے نرغے میں ہے۔ اس بیماری کو آپ ایک قسم کا شدید انفلوئینزا سمجھ لیں۔ اس کیلئے کوئی خاص دوائی ہم نہیں دیتے۔ ٹمپریچر اگر زیادہ ہو جائے تو اسپرین کی دو گولیاں پانی کے ساتھ آپ کھا لیں۔ چار پانچ دن کی تکلیف کے بعد بدن نارمل ہونا شروع ہو جائے گا۔ طبعیت زیادہ بگڑ جائے تو ایمرجنسی میڈیکل ایڈ کو دوبارہ فون کریں۔

دو راتیں جاگنے کے بعد یونس کی طبعیت زیادہ بگڑ گئی تو اُسے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ جمشید کا خیال تھا کہ ڈاکٹروں سے تشخیص میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اگلے روز وہ عیادت کیلئے ہسپتال پہنچا تو اس کے ساتھ حاجی صاحب بھی تھے۔

"کیا حال ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بہت بُرا !!" یونس نے جواب دیا۔

"کیوں؟" حاجی صاحب نے پوچھا۔

"جب میں سوتا ہوں تو میرا جسم بہت لاغر ہو جاتا ہے اور میں بالکل حرکت نہیں کر سکتا۔ میری آنکھیں کھلی ہوتی ہیں لیکن زبان بند۔ اس وقت میں دوسروں کو دیکھ تو سکتا ہوں لیکن بول نہیں سکتا۔ میری اس کیفیت کو کوئی سمجھتا نہیں۔ میرے ہاتھوں میں اتنی قوت بھی نہیں ہوتی کہ میں کوئی اشارہ ہی کر سکوں۔ ان لمحوں میں مجھ پر بس غنودگی چھائی ہوتی ہے۔ یعنی میں سو بھی رہا ہوتا ہوں اور بیدار بھی ہوتا ہوں۔" یونس نے بتایا۔

"اس کو آپ انفلوئینزا کہیں گے؟" جمشید نے پوچھا۔

"ان کا اپنا ایک نظام ہے۔" حاجی صاحب بولے "جس کے مطابق انہوں نے چیزوں کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ اس تکلیف کو یہ انفلوئینزا کہتے ہوں گے۔"

"آپ کے خیال میں یہ کیا ہے؟" جمشید نے پوچھا۔

"بخار کی وجہ سے بے خوابی کی شکائت ہے۔" حاجی صاحب نے بتایا۔

"اس کا کوئی علاج بھی بتائیں۔" یونس نے کہا۔

"بتاتا ہوں۔" حاجی صاحب بولے "جب آپ سونے لگیں تو آنکھیں بند کر کے یہ تصوّر کرلیں کہ آپ عرش الٰہی کے نیچے موجود ہیں۔ زبان سے آپ یاحفیظ، یاشافی اور یاکافی کا ورد کریں۔ آپ تصوّر کریں کہ عرش کے انوار آپ کے اندر جذب ہو رہے ہیں۔ اس عمل کو آپ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک آپ کو نیند نہ آ جائے، یعنی بیداری مکمل طور پر ختم نہ ہو جائے۔"

معلوم نہیں رات کا کونسا پیر تھا کہ یونس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اُسے واضح طور پر پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ بیداری پوری طرح ختم ہو گئی ہے یا ابھی کچھ باقی ہے۔ یکایک اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کا بدن غبارے کی طرح ہلکا ہو رہا ہے۔ پھر وہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ شہر کے اوپر سے گزرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ سڑکوں پر انسانوں کا ہجوم ہے۔ اُس کی طرح سبھی کا رخ اُس میدان کی طرف تھا جسے شہر کا دالان کہا جاتا۔ گہرے اندھیرے کی وجہ سے عورتیں، مرد اور بچّے اپنی آوازوں سے پہچانے جا رہے تھے۔ انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ بہت

دور ٹمٹماتے ہوئے چراغ روشن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اینٹوں سے بنے عارضی چولہوں کے اندر سے ان کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لکڑیاں آہستہ آہستہ آگ پکڑ رہی تھیں۔ دالان میں تل رکھنے تک کی جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے لوگ وہاں پر یاشافی، یاکافی کا ورد کر رہے تھے۔ لنگر پکانے والے دیگوں میں کفگیر چلا رہے تھے۔ مختلف گروہ باجماعت دعائیں مانگ رہے تھے۔ دور کہیں دف بجائی جا رہی تھی۔ ناچنے گانے کی آوازوں کے ساتھ کچھ لوگوں کا گڑگڑانا بھی سنائی دے رہا تھا۔ بعض آوازیں بہت واضح تھیں۔ میری شادی کب ہو گی؟ مجھے دولت کب ملے گی؟ میرے بزنس کو بڑا کر دے۔ کسی لاٹری کا کوئی نمبر بتا دے۔ کیا نوکری ملنے کا کوئی چانس ہے؟ میں ملک سے باہر کب جاؤں گا؟ مجھے اولاد نرینہ چاہیے۔ ہمیں جادو ٹونے سے بچا۔ یا اللہ میری شادی میری محبت سے کرا دے۔ میرے مولا میری بیوی کو میکے سے بُلا دے۔ لنگر پکانے والوں نے دیگوں کو اب ڈھک دیا تھا۔ چولہوں کی آگ سپاٹ لائٹ بن کے گھوم رہی تھی۔ دالان کی فضا میں دھوئیں کے لچھے لہروں کی طرح پھیل رہے تھے۔ کسی نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا دیا۔ ایک دیوار پر بہت بڑی سکرین نمایاں ہو گئی۔ ایم ٹی وی پر نصرت فتح علی خاں گا رہا تھا۔ سپیکر فُل والیوم پر کھُلے ہوئے تھے۔ جھولے جھولے لال۔ دم مست قلندر۔ جھولے جھولے لال دم مست قلندر۔

اگلی صبح یونس کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔

"بخار اتر گیا ہے" ڈاکٹر نے بتایا "اب آہستہ آہستہ تم نارمل ہو جاؤ گے۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ میں نے لکھ دیا ہے۔ ہفتہ بھر گھر میں آرام کرنے کے بعد کام پر جانا۔"

یونس نے ٹیکسی لی اور گھر پہنچ گیا۔

شام کو جمشید آیا تو اُس کے پاس ایک انگوٹھی تھی۔

"اسے پہن لو!" وہ بولا "حاجی صاحب نے دی ہے۔"

"کیوں؟" یونس نے پوچھا۔

"بھئی شفا کے لئے!" جمشید نے بتایا۔ "اُن کے خیال میں تمہاری بیماری محض جسمانی نہیں ہے۔ کچھ گڑبڑ تمہاری روحانی کیفیت میں بھی ہے۔"

"کیا گڑبڑ؟"

"یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔" جمشید بولا۔

"عجیب آدمی ہو" یونس نے کہا "بیماری کا علم نہیں اور دوا اٹھا لائے۔"

"تمہیں تکلیف ہے یا نہیں؟" جمشید نے پوچھا۔

"وہ تو ہے۔" یونس نے جواب دیا۔

"پھر تم پہن لو انگوٹھی۔" جمشید نے اصرار کیا۔

"اس سے کیا ہوگا؟" یونس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"آفات دور بھاگیں گے، دشمن زیر ہوں گے، صحت بحال ہوگی اور مال و دولت آنے کی راہ ہموار ہوگی۔" جمشید کی آنکھوں میں اب شرارت ناچ رہی تھی۔

"یہ انگوٹھی اچھی خاصی قیمتی معلوم ہوتی ہے۔" یونس نے اندازہ لگایا۔

"ہوتی رہے" جمشید بولا "اس کا ہرجانہ تم پر واجب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" یونس نے حیرانی سے پوچھا "کیا حاجی صاحب ایسے قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں فی سبیل اللہ ہی بانٹتے ہیں؟"

"نہیں!" جمشید نے بتایا "عام لوگوں کیلئے خاص ہدیہ مقرّر ہے۔"

"وہ ہدیہ میرے لئے کیوں نہیں ہے؟" یونس نے پوچھا۔

"تمہارے لئے بھی ہوتا ـــ" جمشید نے بتایا "لیکن تم عام آدمی نہیں ہو۔ میرے دوست ہو تم۔ کسی مریض کو خود سے دیکھنے کیلئے حاجی صاحب کبھی نہیں جاتے۔ اور ہسپتال جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں دیکھنے وہ میری خاطر چلے گئے۔ انہیں خبر ہے کہ میں انہیں بہت مانتا ہوں اور تمہارے ساتھ میری پکّی دوستی ہے۔ اب تم سے وہ ہدیہ کیوں لیں گے؟ --- بالکل نہیں لے سکتے۔"

"پھر تو اُن کا احترام کرنا چاہیئے، یونس بولا۔

"میں تو کرتا ہوں۔" جمشید نے بتایا "میرے لئے وہ حاتم طائی ہیں۔ میں انہیں سوال بتاتا ہوں۔ اُن کا حل ڈھونڈنے کیلئے وہ کمر کس لیتے ہیں۔"

"اچھا میرے جیمز بونڈ!" یونس نے کہا "تم جیتے میں ہارا۔"

اگلے روز کیتھرینا واپس آ گئی۔

"میرے پیچھے منگنی کر لی تم نے؟" انگوٹھی دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" یونس کچھ حیران ہُوا۔

"چھنگلی کے ساتھ والی انگلی میں انگوٹھی آ گئی ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ زندگی کے مستقل سنگی ساتھی سے منسوب جملہ حقوق محفوظ ہو چکے ہیں۔" کیتھرینا نے بتایا۔

یونس نے وضاحت کے طور پر کیتھرینا کی غیر حاضری میں جو کچھ جیسے وقوع پزیر ہُوا تھا وہ تفصیل سے بتایا۔ حاجی صاحب کی تشخیص اور جمشید کی تجویز کے بارے میں اطلاع دی اور آخر میں بتایا کہ انگوٹھی کیلئے انگلی کا انتخاب علاج کے ساتھ مشروط ہے۔

"کیا اس طرح کے علاج پر تم یقین رکھتے ہو؟" کیتھرینا نے پوچھا۔

"نہیں!" یونس نے فوراً جواب دیا "میں نے تو صرف جمشید کو خوش کرنے کیلئے یہ انگوٹھی پہنی ہے۔"

"چلو!" کیتھرینا بولی "تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

"تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟" یونس نے پوچھا۔

"نہیں!" کیتھرینا نے جواب دیا "ہمارے مشترکہ جاننے والے یہ سمجھیں گے کہ اب میرے تمہارے رشتے میں پختگی پیدا ہو گئی ہے۔"

"یعنی میں انگوٹھی پہنے رہوں؟"

"بے شک پہنے رہو۔" مسکراتے ہوئے کیتھرینا بولی۔

یونس نے اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ چھنگلی کے ساتھ والی انگلی میں انگوٹھی موجود تھی۔ ڈرائینگ روم کے دائیں کونے میں رکھا دن رات جلا رہنے والا لیمپ بجھا ہوا تھا۔ ہفتہ پہلے کیتھرینا نے منہ سے تو کہہ دیا تھا کہ انگوٹھی پہنے رہو لیکن دل میں یہ طے کر لیا ہوگا کہ وہ چلی جائے گی۔

"کیتھرینا چلی گئی ... ؟؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"اب کیا کروں؟" یونس نے سوچنا شروع کیا۔

پھر اُس نے وہی کیا جو مسئلے مسائل کی صورت میں وہ کیا کرتا۔ اُس نے جمشید کو فون کیا۔ وہ فوراً چلا آیا۔

"میں تو جشن منانے آیا تھا۔" جمشید بولا "اور یہاں سوگ کا سماں ہے!"

"جشن کاہے کا؟" یونس نے پیچھا۔

"کیتھرینا کے چلے جانے کا۔" جمشید نے جواب دیا "اس کا تمہارے ساتھ رہنا مجھے کبھی پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟" یونس نے پوچھا۔

"اس نے ہمیشہ تمہیں استعمال کیا ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟"

"نارویجن مردوں کے معیار سے دیکھو تو حسن اُس کے قریب

سے نہیں گزرا۔ "

"تمہارے خیال میں بدصورت ہے وہ؟"

"جی بھر کے بھدّی۔" جمشید نے بتایا "اس کے باوجود تمہارے فلیٹ کی صورت میں اسے مفت رہائش ملی رہی۔"

"میری مرضی سے۔" یونس نے دعوی کیا۔

"نہیں!" جمشید نے اختلاف کیا۔ "وہ یہاں اپنی مرضی سے رہی۔ اس نے خود کو تم سے نہیں لیمپ سے جوڑ کے رکھا۔ تمہیں تو اُس نے اتنا حق بھی نہیں دیا کہ تم اُس سے چھوڑ کر جانے کی وجہ پوچھ سکو۔ تمہیں تو بس لیمپ کو دیکھنا تھا۔ وہ جل رہا ہے تو کیتھرینا تمہارے ساتھ ہے۔ لیمپ بجھ گیا تو وہ چلی گئی۔"

یونس کی سماعت اُس کی آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔

"اگر تمہارے جیسے نارویجن لڑکے کے ساتھ وہ رہنا چاہتی تو ایسا فلیٹ کیتھرینا خریدتی اور لڑکا اُس کے ساتھ فری میں رہتا۔" جمشید نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب تم بے فکر ہو جاؤ۔ عنقریب تم ایک نئی زندگی شروع کرو گے۔ تمہارا جیمز بونڈ اور میرا حاتم طائی --- ہم دونوں مِل کر انتظام کر رہے ہیں۔"

"کیا؟ ... کس چیز کا انتظام کر رہے ہو تم لوگ؟" یونس کی محویت ٹوٹ گئی۔

"تمہارے نکاح کا۔" جمشید ہنستے ہوئے بولا "جسمانی بیماری تو گئی ہی تھی اب تمہاری روحانی گڑبڑ بھی ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گی۔"

اُسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو!" ریسیور اٹھاتے ہی یونس بولا۔

"میرا آج اوور ٹائم ہے۔" دوسری طرف کیتھرینا تھی۔ "میں کچھ دیر سے گھر آؤں گی۔" اُس نے بتایا۔

"تو تم آ رہی ہو؟" یونس نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" کیتھرینا نے حیرانگی سے کہا۔

"بھئی تمہارا وہ کونے والا لیمپ آج بجھ ہُوا ہے۔" یونس نے بتایا۔

"وہ؟ — اچھا!" وہ زور سے ہنسی "اس کا کنکشن خراب ہے۔" کہتے ہوئے کیتھرینا نے فون بند کر دیا۔

چھنگلی کے ساتھ والی انگلی سے یونس نے انگوٹھی اتاری اور جمشید کو دیتے ہوئے وہ بولا "یہ حاجی صاحب کو واپس کر دینا۔ میری طرف سے اُن کو بتانا کہ اب کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ بیماری جا چکی ہے اور کیتھرینا آ چکی ہے۔ شکریہ!"

قدر و قامت

"پاکستان میں قیام کے دوران مجھے ایک بات اچھی لگی اور ایک بُری۔" ہفتے کی شام مونیکا نے بتایا۔

"بُری بات کیا تھی؟" دھڑکتے دِل سے میں نے پوچھا۔

"سواری!" اُس نے جواب دیا۔ صدر، وزیراعظم اور گورنر قسم کے وی آئی پی لوگوں کی سواری۔ جس کے باعث ٹریفک روک دی جاتی۔ کئی کئی گھنٹوں کیلئے۔ ہمارے طے شدہ پروگرام چوپٹ ہو جاتے۔"

"اور اچھی بات — وہ کیا تھی؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"میری ایک دریافت!" اس نے بتایا۔

"کیا؟" ہمارا تجسّس بڑھ گیا۔

"اردو ایک آسان زبان ہے۔" مونیکا بولی۔

"واقعی؟؟"

"ہاں!" اس نے بتایا، "جو لفظ بھول جاؤ اس کا انگریزی متبادل استعمال کرو۔"

"اس بات کو تم دریافت کیوں کہہ رہی ہو؟" بیگم نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اوسلو میں کورس کے دوران یہ گُر کسی نے بتایا ہی

نہیں۔" مونیکا نے جواب دیا۔ "اپنے تجربے اور مشاہدے سے میں نے خود اسے دریافت کیا۔"

"یہ تو تھیں مذاق کی باتیں۔" ہمارے لٹکے ہوئے منہ دیکھ کر وہ بولی۔ "پاکستان میں سب سے اچھے تھے میرے میزبان۔ تم لوگوں کے عزیز و اقارب اور دوست احباب۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھے وہاں کے کھانے۔ ہر روز ناشتے میں مجھے پراٹھا ملتا۔ اب بریڈ بدذائقہ لگتی ہے۔ پھر پھل اور پھول وہاں پر بہت تھے۔ خوش بو، رنگ اور ذائقوں نے بہت مزہ دیا۔"

جب اس نے تحفے تحائف نکالے تو ہفتے کی شام سج گئی۔ باتوں میں گرم جوشی بڑھتی چلی گئی۔ جونہی مونیکا نے تصویریں نکالیں، بچوں نے ٹی وی بند کر دیا۔

"میں تو پراٹھے کا ناشتہ کروں گا۔" اتوار کی صبح میرے بیٹے نے فرمائش کی۔

"ابھی بنا دیتی ہوں۔" میری بیوی بولی "لیکن ایک شرط ہے۔"

"کیا؟" یاسر نے پوچھا۔

"ناشتے کے بعد اپنے ابّو کو تم اردو پڑھ کر سناؤ گے۔"

"ٹھیک ہے!" ہمارے بیٹے نے حامی بھر لی۔

"تم پراٹھا کھاؤ گے؟" بیگم کی شرطیہ نظریں اب میری طرف اٹھیں۔

"سبق میں سُن لوں گا۔" مجھے اپنی بیوی کے عزائم کا اندازہ ہو

گیا۔ پراٹھے کے ذکر سے میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ میں نے ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔

"اردو کی تیسری کتاب میں "اسلامی مساوات" پر یاسر کا سبق تھا۔ ناشتے کے بعد اُس نے پڑھنا شروع کیا: حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے زمانے میں شام کے ملک کو جانے والے تھے۔ ایک خادم بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اونٹ ایک ہی تھا۔ اس پر سامان بھی لدا ہُوا تھا اس لئے صرف ایک ہی آدمی سوار ہو سکتا تھا۔ سفر شروع ہُوا تو حضرت عمرؓ اور خادم باری باری اونٹ پر سوار ہوتے اور باری باری پیدل چلتے، اسی طرح سفر کرتے وہ شام پہنچ گئے۔"

"ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو یاسر چپ ہو گیا۔ میں نے ٹیلی فون اٹھا لیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف گروبابا تھے۔

"تمہیں اپنا سوال یاد ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بالکل یاد ہے" میں نے اعتماد سے کہا۔ "اعلیٰ قدروں کی تخلیق کیسے ہوتی ہے؟" مجھے اپنا پروجیکٹ فوراً یاد آگیا۔ ادیبوں کے مرکز میں نوجوانوں کیلئے منظّم کی گئی ورکشاپ میں مجھے "اقدار اور اعمال" کے موضوع پر گفتگو کرنا تھی۔

"اس سلسلے میں کچھ مواد میرے ہاتھ لگا ہے۔" گروبابا نے بتایا۔

"وہ لینے کیلئے میں کب آؤں؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"بے شک ابھی آجاؤ۔" وہ بولے "ویسے جب جی چاہے۔

جب وقت ہو۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔

"اب تم گروبابا کے ہاں جاؤ گے؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"تم نے کیسے جانا؟" میں نے پوچھا۔

"چھٹی کے دن اگر وہ فون کریں تو تم اُن کے پاس ضرور جاتے ہو۔" اس نے اپنا تجربہ بتایا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔"

"بچّہ اردو کا سبق ختم کر لے تو چلے جانا۔" محترمہ اچھے موڈ میں تھیں۔

چھٹی کے دِن میرا گھر سے اکیلے کہیں جانا میری بیوی کو آگ لگا دیتا۔ پردیس کے تلخ تجربوں کی ساری کڑواہٹ اُس کے لہجے میں فوراً گھُل جاتی۔ جو کچھ بھی وہ کہتی اس کا لبّ لباب یہ ہوتا کہ میں تو کہیں جشن منانے جا رہا تھا اور وہ بیچاری ماتم کیلئے اکیلی رہ جائے گی۔ گویا میرے بعد محض سینہ کوبی اُس کا مقدّر ہو گا۔ بغیر کسی دلاسہ دینے والے کے جو اس کے ہاتھ روک سکے یا آنسو پونچھ سکے۔ لیکن ایک بات حیرت انگیز تھی۔ جب کبھی میں گروبابا کے ہاں جانے کی بات کرتا تو وہ چپ رہتی۔ نہ اُس کی آنکھیں چیختیں نہ اُس کی زبان چلتی۔

"اچھا ! کبھی اس بھید کی کھوج بھی لگائیں گے۔" میں نے دِل ہی دِل میں سوچا۔

یاسر نے آگے پڑھنا شروع کیا: اسلامی فوج کے مجاہد شہر سے باہر نکل کر حضرت عمرؓ کی راہ دیکھ رہے تھے۔ عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ

مسلمانوں کے خلیفہ بڑی شان و شوکت والے ہوں گے۔ اس لئے وہ بھی انہیں دیکھنے کیلئے آ گئے تھے۔ اتنے میں گرد و غبار اڑتا نظر آیا۔ پھر سوار اور حضرت عمرؓ دکھائی دیئے۔ کسی عیسائی نے مسکراتے ہوئے ایک مجاہد سے پوچھا "یہی ہیں تمہارے خلیفہ جو اونٹ پر سوار ہیں؟" مجاہد نے جواب دیا "نہیں ہمارے خلیفہ تو وہ ہیں جن کے ہاتھ میں اونٹ کی مہار ہے اور وہ جو اونٹ پر سوار ہے، وہ ان کا خادم ہے۔" عیسائی اس مساوات کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"سبق ختم!" کتاب بند کرتے ہوئے یاسر نے کہا۔

"پراٹھا ہضم!" میں نے اپنی بیوی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اب گروبابا کے ہاں جانے کی تیاری کرنا تھی۔

"اقدار اور اعمال" کے حوالے سے میری ڈائری میں فی الحال ایک ہی نوٹ تھا کہ ایک زمانے میں بادشاہ کا سامنا ہوتے ہی عوام کے سر جھک جاتے تھے، اور اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ منتخب ہونے والے صدر سر جھکا کر اپنے ووٹروں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ مزید مواد کی امید میں کاغذ پنسل میں نے جیب میں رکھے اور نکل پڑا۔

"آپ کس مواد کی بات کر رہے تھے۔" گروبابا کے ہاں پہنچتے ہی میں نے پوچھا۔

جلی حروف میں لکھے نام والی ایک کتاب انہوں نے اٹھالی "میڈ اِن ناروے" نیچے ایک ذیلی سرخی تھی "نارویجن دوسروں کی نظر میں"۔ کتاب کو وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "پہلا باب عرب کے ایک بزنس ایگزیکیٹو کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ اسے تم پڑھ لو۔"

کتاب میں نے پکڑ لی۔ یہ ۱۹۸۸ میں ناروے سے شائع ہوئی تھی اور انگریزی زبان میں تھی۔ پہلا باب نکال کے میں نے پڑھنا شروع کیا:
مجھے یاد ہے جب تخت کا وارث شہزادہ ہارالڈ (ناروے کا موجودہ بادشاہ) شاہ خالد سے تعزیت کرنے سے سعودی عرب آیا تو شاہی آداب کا خیال رکھنے والے بعض لوگوں کی آنکھیں حیرانی سے پھیل کر رہ گئی تھیں۔ سعودی عرب میں شاہی خاندان اور کئی دوسرے کاروباری لوگوں کے پاس ذاتی جیٹ طیارے موجود ہیں، اور ناروے کا شہزادہ ایک مسافر کی طرح عام سواری جہاز سے پہنچا تھا۔

ایک دوسرے موقع پر ایک نارویجن ملاح کو اپنے بحری جہاز پر ایک خوفناک حادثہ پیش آگیا جس سے اُس کی کھوپڑی پر ضربیں آئی تھیں۔ سعودی کے کسی بھی ہسپتال کیلئے یہ کیس بہت مشکل تھا۔ جب ناروے سے ایک ہوائی ایمبولینس اسے لینے کیلئے جدّہ پہنچی تو سعودی امیگریشن کے افسران نے سمجھا کہ وہ ملاح ناروے کے کسی اعلیٰ عہدیدار کا بیٹا تھا۔ آپ اُن کے چہروں کی حیرانی کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں جب ان کو معلوم ہُوا کہ وہ ایک عام شہری تھا اور اسے عام طبّی سہولت مہیا کی جا رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ملاح کو برین سرجری (دماغ کی جراحی) کیلئے ناروے لے جانے کیلئے ایک پرائیویٹ جیٹ طیارہ ڈاکٹر اور نرسیں لے کر آیا تھا۔

"پڑھ چکے؟" گروبابا نے پوچھا۔

"جی!" میں نے جواب دیا۔

"اپنے سوال کا جواب تمہیں مِل گیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" میں نے بتایا۔

"کیوں؟" وہ حیرانی سے بولے "تم نے پوچھا تھا اعلیٰ اقدار کیسے تخلیق ہوتی ہیں؟"

"جی" میں نے اتفاق کیا۔

"تو جواب یہ ہے کہ اعلیٰ اقدار انسان کے اعلیٰ اعمال سے تخلیق ہوتی ہیں۔" گروبابا نے بتایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات کو سونے سے پہلے میری بیوی نے گروبابا کے ہاں میرے جانے پر اپنے نہ بولنے کا بھید خود ہی کھول دیا۔ اس نے بتایا کہ جاتے ہوئے میں جتنا بھی بے چین ہوں واپسی پر کوئی بے چینی میرے ساتھ نہیں ہوتی۔

"آج صورت حال مختلف ہے" میں نے بتایا۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے مغرب کی نئی نسل کیلئے مشرق کی ہم عصر دنیا سے اعلیٰ اقدار کی مثالیں درکار تھیں اور گروبابا لے بیٹھے مغربی شہزادوں کے قصّے۔" میں نے جواب دیا۔

"انسانوں کو دوسرے کی تھالی کا لڈو بڑا لگتا ہے۔" میری بیوی نے کہا۔ پھر وہ چٹکی بجا کر بولی "تم مونیکا سے بات کرو۔ شاید اس کے پاس مشرقی شہزاروں کا کوئی قصّہ ہو۔"

"شاید؟" میں نے کہا اور بتّی بند کر دی۔

(زیر تصنیف قیام نامہ ناروے "آدھی رات کا سورج" سے ایک باب)

سائیں سچُا

کالے جوتے

جمعرات، ۱۷ نومبر، ۱۹۹۴ء۔ بوقت صبح ۹.۰۰

برگر یارل روڈ X کنگستین روڈ

میری توجہ سب سے پہلے بھڑکیلی نیلی روشنیوں پر مرکوز ہوئی تھی۔ یہ ضرور کوئی ایمبولینس یا پولیس کی گاڑی ہو گی! میں نے سوچا؛ لیکن پھر میں نے کار کو رودمانز روڈ پر ڈال دیا تاکہ میں اپنے مہمان کو ہوٹل برگر یارل سے لے آوں۔ مگر کوئی الجھن مجھے پریشان کرتی رہی — روشنیوں کی بہت سی برقیلی لہروں نے میرے ذہن پر اپنے عکس چھوڑ دئے تھے!

مجھے ہوٹل کے باہر اپنا مہمان نہ ملا۔ بجائے اُس کا انتظار کرنے کے میں نے گاڑی کو کنگستین روڈ پر گھما دیا، جہاں پر چمکیلی روشنیوں کا سیلاب بہتا نظر آ رہا تھا۔ جب میں تماشائیوں کے اس خاموش ہجوم کے پاس پہنچا جو زمین پر پڑے دو سٹریچروں کو گھور رہے تھے تو مجھے تین سپاہی، پولیس کی دو گاڑیاں اور ایک ایمبولینس بھی نظر آئی۔ قریب پہنچنے پر میں نے سپاہیوں اور ایمبولینس کے عملہ کی جانب پھر دیکھا: وہ کچھ بھی نہیں کر رہے تھے ... صرف وہاں کھڑے خلا میں یوں تک رہے تھے گویا وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں! اُن بھڑکیلی روشنیوں، بے حس

سپاہیوں اور بے جان ہجوم سے مسحور میں نے دھیرے سے گاڑی کو برگر یارل روڈ پر موڑ کر راستہ روکے ایس ایل بس کے پیچھے کھڑا کر دیا۔

تب میں نے پٹری پر کھڑی سائیکل اور پاس پڑے تھیلے، سڑک پر ترچھی کھڑی سبز کار اور اس سے چند میٹر آگے ایک اور بس کو بھی دیکھا۔ بس کی پیلی بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑیوں، ایمبولینس، سائیکل، سبز کار اور بس کے درمیان سڑک پر اس مجمع کو ساکن کر دینے کا سبب موجود تھا۔ ویسے اب وہاں کوئی کچھ کر بھی کیا سکتا تھا! ایک سٹریچر تو خالی تھا مگر دوسرے پر ایک بھورے رنگ کا کمبل کسی ایسی شے کو ڈھانپے ہُوا تھا جسے موت نے اب ایک نئی شناخت دے دی تھی — "میں ہوں" سے وہ اب "وہ تھا" بن چکا تھا۔ مجھے مکمل یقین تھا کہ وہ ایک لاش ہی تھی، گو اس کا پورا جسم کمبل کے نیچے پنہاں تھا — سوائے ان دو کالے جوتوں کے جو آسمان کا رُخ کئے ہوئے تھے۔ سٹریچر کی دوسری طرف، جہاں سر ہونا چاہیے تھا، ایک سرخ دھبہ سڑک کو رنگ دے رہا تھا، اور کچھ سینٹی میٹر پرے سرخ و سفید رنگ کا ایک مواد پڑا تھا، جسے پہلے تو میں نے قیاس کیا لیکن بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ وہ خون سے لتھڑا ہوا بھیجا تھا۔

میں اُس سائیکل یا تھیلے دونوں کو ہی نہ پہچان پایا، اور ویسے بھی میرے واقفکاروں میں سے بہت کم افراد سائیکل کا شوق رکھتے ہیں؛ مگر، پھر بھی کسی پھانس نے مجھے بے چین رکھا! میرا راستہ روکنے والی بس اب جا چکی تھی، لیکن میری گاڑی اب تک صرف چند میٹر ہی رینگی ہوگی۔ اُف! میں کتنا خواہشمند تھا کہ کاش ہوا کا ایک تُند بگولا آئے اور

اُس کمبل کو صرف اِک لمحے کے لئے اٹھا کر مجھے کوئی شناخت کرا دے! مجھے کسی ایک نشان کی ضرورت تھی ۔ اُس کے چہرے کی جھلک، بالوں کا رنگ... کچھ بھی ۔ کہ میں یقین کر سکوں کہ ہم دونوں غیر آشنا تھے۔ پھر مجھے اپنے ذہنی کرب کی وجہ سمجھ آئی ۔ تقریباً، میرے ہر واقف کار کے پاس کالے جوتوں کا جوڑا ہے... ویسے ہی دو جوتے جو سٹریچر پر بچھے ہوئے کمبل سے نِکل کر اس امر کی نشان دہی کر رہے تھے کہ ایک انسان اُس کمبل کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر وہاں خیالات کی جھاڑیوں میں اٹکا رہا۔ کوئی طویل عرصہ تو ہو نہیں سکتا تھا، گو لگ رہا تھا کہ صدیاں بیت گئی ہوں ! وہ ایک سپاہی کی گھور تھی جس نے مجھے متحرک کیا۔ اُس نے مجھے کہا کچھ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے چہرے پر چھائے ہوئے جذبات نے اُسے میرے اندرونی ہیجان سے مطلع کر دیا ہوگا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر میں وہاں سے چل دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ ریڈیو ستاک ہولم اپنی، ہر آدھے گھنٹہ کے وقفہ بعد نشر ہونے والی، ٹریفک رپورٹ میں لوگوں کو برگر یارل روڈ پر ٹریفک رُکنے کی اطلاع کرتا رہا۔ دس بجے ریڈیو نے کہا کہ اب پولیس ٹریفک کو عارضی طور پر بالکل بند کر رہی تھی تا کہ ایک حادثہ کے بعد سڑک صاف کی جا سکے -- وہ جو کچھ دیر پہلے اشرف المخلوقات سمجھا جاتا تھا اب مٹی کی چادر پر محض ایک دھبہ بن چکا تھا جسے دھو کر زمین کی

چھاتی کو پھر پاک کرنا ضروری تھا!

تب اُس احساس نے مجھے آ جکڑا تھا — سینے میں گھٹن والے ! کوئی درد نہیں تھا، نہ ہی کوئی اور تکلیف: صرف سینے کے پٹھوں میں اکڑن، اور یہ احساس کہ صبح کی لطیف ہوا اچانک دُھند کی مانند بوجھل ہو گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ آخر کار حقیقت نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہوگا۔ میرے پیشہ میں مجھے مختلف قسم کی اذیتّیں اور دُکھ دیکھنے کو ملتے ہیں، اور حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؛ لیکن، کبھی کبھی حقیقت کا دھچکا اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ ذہن کی برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اُس دن بھی مجھے اسی احساس نے آ پکڑا تھا جب ایسٹونیا غرق ہوئی تھی۔ صبح صبح میں نے مقامی اخبار، داگنز نیہیتر، میں پڑھا تھا کہ ایک بڑی کشتی آٹھ سو مسافروں سمیت ڈوب گئی، اور میں نے اخبار کو ایک طرف یوں رکھ دیا تھا گویا کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔ بالکل غیر قابل یقین بات تھی کہ ہمارے اپنے گھر کے پاس اتنا بڑا حادثہ ممکن ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے اپنے تالاب، بالٹک سمندر، میں آٹھ سو لوگ ڈوب جائیں! اس طرح کے واقعات تو صرف دور دراز جگہوں پر ہُوا کرتے ہیں، جہاں یہ کافی ہوتا ہے کہ بِلاخود کوئی نقصان محسوس کئے صرف انسانی ہمدردی دِکھا دی جائے۔ مگر بعد میں، بہت بعد میں، جب ریڈیو بار بار دھراتا رہا کہ ایسٹونیا سچ مچ غرق ہو گئی، اور مجھ سے ملنے والے لوگ بجائے کچھ کہنے کے، نظریں چُرائے، گویا وہ آج اپنے زندہ ہونے پر شرمندہ ہوں، آ کر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ تب بھی حقیقت نے، جسے میں اپنے لاشعور

میں کفن پہنانے کی کوشش کرتا رہا تھا، اچانک برہنہ ہو کر میرے دھیان پر پنجہ مارا تھا۔ اُس روز بھی یہی گھُٹن والا احساس در آیا تھا اور بہت دِن میرے ساتھ رہا تھا۔

باقی دِن میں نے اپنے کام پر متوجہ ہونا چاہا پر ذہن تعاون سے انکار کرتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ وہ کون کمبخت تھا جو اب نہیں ہے! کیا شہر میں کوئی ایسی بچّی موجود ہے جس نے اپنے بابا سے صبح کہا ہوگا کہ وہ آج گھر لوٹتے ہوئے مِٹھائی ساتھ لانی نہ بھولیں؟ کیا آج ایک بچّہ صرف مایوسی کی خاطر اپنے باپ کا انتظار کرے گا کہ وہ اُسے بتا سکے کہ آج اُس نے اپنے سکول میں کتنا اچھا پرچہ کیا؟ وہ کونسی سہاگن ہے جو آج کے بعد اپنے بال کھولے، سر پر غم کی کالی چادر پہنے اپنے آپ کو اب بیوہ کہے گی؟ شاید مر جانے والا اُن لوگوں میں تھا جو کبھی اپنا گھر نہیں بسانے — محض سال میں ایک مرتبہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کرسمس کی شام کا کھانا ہی ان کے لئے خاندانی فرائض کی حد ہوتی ہے! تو کیا اِس برس کرسمس کی شام کوئی ایسی بڑھیا ہوگی جو ایک میز کے پار بیٹھ کر ایک خالی کرسی کو دیکھ دیکھ کر ہلکتے دل اور یاد کی پرچھائیوں کے ساتھ وقت گزارے گی؟ یا... یا... دکھ کے کتنے رُوپ ہو سکتے ہیں؟ اور اپنے ہر رُوپ میں ہر دکھ ہزاروں خوشیوں پر حاوی!

کل ہی میری ایک ہم سفر خاتون نے کس طرح یہ فقرہ کسا تھا "ارے... ارے! شہر میں ایک فلیٹ خالی ہوتے ہوتے رہ گیا۔" جب ایک بے فکرا سائیکل سوار اپنا راستہ اچانک بدل کر میری کار کے

آتا آتا بچا۔ ہم دونوں نے اُس جملے پر زبردست قہقہے لگائے تھے۔

اور اب جب ممکن ہے شہر میں ایک فلیٹ خالی ہو، ایک ایسا بستر جس میں کوئی سونے والا نہیں یا ایک ایسی کرسی جو اب صحبت کو ترسے گی، تو اُس جملے کا مزاح بھی مر چکا تھا۔ ایک امکان کی لطافت کو حقیقت کے بھیانک تھپڑ نے فنا کر دیا تھا۔

رات کافی گزر چکی ہے، مگر نیند پاس آنے سے گریزاں ہے : اُسے ڈر ہے کہ شاید مجھے خواب میں وہ نظر آئیں — آسمان کی طرف منہ کئے دو کالے جوتے !

جمعہ، ۱۸ نومبر، ۱۹۹۴۔ رات ۱.۲۵

سولینتونا۔

بلکہ ...

حکیم صاحب کے نورانی چہرے پر ان کی اندرونی کیفیت کا اظہار کم لیکن ڈوبتے سورج کی سرخی کا اثر زیادہ تھا۔ انہوں نے اپنے مدبرانہ انداز میں دائیں بائیں نظر گھما کر دیکھتی اور نا دیکھتی آنکھوں کو اپنی مسکراہٹ نوازی، پھر ان کی انگلیاں بے خیالی میں اپنی تسبیح کے دانوں کو الٹا پھیرنے لگیں۔ سامنی دیوار پر بڑھتی ہوئی ظلمت نے انہیں دِن کے کوچ اور رات کی آمد کی خبر کر دی تھی۔

انہوں نے آنکھ کی جھپک کے دوران پھر اُس بوڑھے کو دیکھا جس کی آمد نے اُن کی ساری دُنیا اُوپر نیچے کر ڈالی تھی۔

حکیم فضل اللہ خان نے چھتیس سال پہلے طِب کے امتحان میں کامیابی کے بعد اور بڑے شہر سے اُس چھوٹے سے شہر میں منتقل ہوتے وقت اپنے ہمسائیوں کے لئے، باوجود اپنے پکّے رنگ، چھوٹا قد اور گہرے کالے بالوں کے، اپنا آغاز اُن گھڑ سواروں کے نطفہ سے وابستہ کیا تھا جو وقتاً فوقتاً شمال کی پہاڑیوں سے وارد ہو کر اُن کے موجودہ وطن اور گزشتہ ماؤں کی عزت پامال کیا کرتے تھے۔ عجب بات یہ ہے کہ جتنا

وہ اپنے مریضوں اور واقفکاروں کے درمیان بیٹھ کر اپنے مفروضہ آباواجداد کی زیادتیوں کا ذکر کرتے اتنی ہی اُن کی شہرت بڑھتی جاتی کہ وہ اُن مردوں کا تخم ہیں جو کسی کو نہیں چھوڑتے! بات اگر گھر سے باہر کی شہرت تک ہی رہ جاتی تو زندگی خوب بسر ہوتی، مگر گھر کے اندر کا ماحول کچھ نرم تھا — گو، حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق، اللہ نے انہیں سب کچھ دیا تھا، لیکن قدرت نے اُن کے ساتھ ایک بہت بڑی زیادتی کر ڈالی تھی -- ذہنی سطح پر تو اُن کی مردانگی پر کسی کو شُبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر صرف وہ خود، روشن بیگم اور اُن کی دوسری بیگمات ہی جانتیں تھیں کہ وہ اپنی ازواجی زندگی کے پہلے چند سال کی کسرت کے بعد جسمانی طور ایک عرصہ ہوا "صوفی" بن چکے تھے۔ ظاہر ہے کے ایک قابل شخص کے ذہن اور جسم کے ٹکراؤ میں جیت ذہن کی ہونی تھی ... یعنی گھر کے اندر لاج کا پرچم کھڑا ہو یا نہ ہو گھر سے باہر اُس کا لہرانا لازم تھا ! ویسے بھی اُن کے فن سے کتنی بڑی زیادتی تھی کہ اُن کے وہ نسخے جنہوں نے غیروں کے جھکے ہوئے سر پھر کھڑے کر دیئے تھے اُن کی اپنی علّت کے مقابلہ میں باری باری بیکار نکلے۔ زندگی بڑھے روشن بیگم کی کہ اُن کا چپکے سے کان میں دیا ہوا مشورہ حکیم صاحب کے لئے تین طرح سے کار آمد ثابت ہوا تھا ... سُنّت کی سُنّت پوری ہو جاتی، غیروں اور اپنوں میں اُن کی حکمت کا چرچا بڑھ جاتا، اور سب سے اہم — وہ جو کبھی دوسروں کی ماؤں کو اٹھا لے جاتے تھے آج اُن کی بیٹیاں منگوائیں جاتیں تھیں۔ چنانچہ حکیم صاحب ہر دوسرے برس روشن بیگم کے تحت تینوں بیگمات میں سے ایک کو باعزت طلاق دے کر بڑی دھوم دھام سے

نئی دلہن بیاہتے تھے۔ اور اپنی شہرت قائم رکھنے کے لئے وہ اپنی دلہن ہمیشہ سرحد کے پار دودھیا رنگ اور سنہرے بالوں والوں سے خریدا کرتے تھے۔

اُن کی اس رسم کی اتنی دھوم مچ چکی تھی کہ انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ روشن بیگم کے بعد کب انہوں نے خود کسی منکوحہ کو پسند کیا ہو۔ دختر فروش اب دوسرے سال کے اختتام سے پہلے ہی روشن بیگم کے پاس ضرورت مندوں کی بیٹیوں کی تصاویر اور ان کے دام لے آتے، اور سودا ہو جانے پر وہ خود ہی اپنی پسند کی کنواری کا ہاتھ حکیم صاحب کے ہاتھ شب عروسی میں تھما دیتیں۔

حکیم صاحب نے اپنا گھر بھی اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ بازار کی سمت میں تو ان کا طبِ یونانی کا دواخانہ اور دکان تھی، جس کی بغل میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو باغیچہ کے پار سیدھا روشن بیگم کے کمرے کا راستہ دِکھاتا تھا۔ دواخانہ کے پیچھے ایک بڑا کمرہ تھا جو حکیم صاحب دوپہر کی گھڑی میں آرام کے لئے استعمال کرتے؛ بڑے کمرے کے عقب میں خلوت گاہ تھی جہاں حکیم صاحب کبھی کبھی روشن بیگم اور اپنی دوسری ازواج سے ملتے تھے اور اس کے پیچھے زنان خانہ کے پانچ کمرے تھے جہاں روشن بیگم اورانکی تینوں بیویاں رہتیں تھیں -- حکیم صاحب کو درحقیقت روشن بیگم کے سوا اکثر کسی اور بیوی کا نام یاد بھی نہیں رہتا تھا کیونکہ اُن سے حکیم صاحب کی قربت دھیمی روشنی اور قلیل لمحات کے دوران ہی ہُوا کرتی تھی، اور ویسے بھی کسی کا ہاتھ تھامنے کے لئے اُس کا نام جاننے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ حکیم

صاحب کے لئے کسی کی نبض کا تیز ہونا تو صرف بخار ہی کی علامت تھی نا!

گھر کا یہ نقشہ بھی روشن بیگم کا معیّن کردا تھا۔ حکیم صاحب نے بھی روشن بیگم کا سب نظام قبول کر لیا تھا، سوائے ایک چیز کے ۔۔ خلوت گاہ میں لگا ہوا قد آدم آئینہ۔ نہیں آئینے میں کوئی نقص نہیں تھا، صرف جو کچھ بھی وہ آئینہ انہیں دِکھاتا تھا وہ انہیں پسند نہ تھا: پورا شہر اُنہیں بطور خان صاحب قبول کرتا تھا، اخباروں میں ان کا اشتہار حکیم فضل اللہ خان کے نام سے آتا تھا، روشن بیگم تک اُنہیں خان صاحب کہتیں تھیں؛ تو پھر وہ شیشے کا لکڑی کے چوکھٹے میں مقیّد ٹکرا کیوں اُنہیں ایک ایسی ہستی کے روبرو کرتا تھا جو اُنہیں کسی طرح بھی اُن نامور پہاڑی لٹیروں کی جائز یا ناجائز اولاد نہیں لگتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہ آئینہ وہاں سے اٹھوا کر اُس کی جگہ کسی مصور کے تخیل اور ان کے اپنے دِل میں چھُپی ہوئی تصویر کے خاکہ کو دے دی تھی... گھوڑے پر سوار، تلوار لہراتا مرد اگر اُن کے اصلی آباواجداد میں سے نہیں تھا تو کیا ہُوا؟ اُسے ہونا چاہیے تھا!

گو حکیم صاحب کے جسم نے انہیں ان کی بیگمات کی پوری قربت سے محروم کر دیا تھا، مگر انہیں اپنی قسمت پر تب بھی ناز تھا، جس میں روشن بیگم کی تقدیر ان کے سپرد کر دی گئی؛ اور انہوں نے روشن بیگم کی خوشی میں کبھی کسی چیز کی کمی نہ رکھی تھی۔ اسی لئے جب ایک برس پہلے روشن بیگم نے اپنے سرحد کے پاس آبائی گاؤں سے

لوٹ کر اُن کو نسیم کا ہاتھ تھامنے کے لئے کہا تو حکیم صاحب فوراً رضامند ہو گئے تھے۔

"خان صاحب! اس مرتبہ وہ ستم کر رہی ہوں کہ آپ بس اُف اُف کرتے رہ جاہیں گے،" روشن بیگمنے انہیں اپنی نشیلی، گلابی ڈوروں والی آنکھوں سے تکتے ہوئے کچھ اِس طرح سے کہا تھا کہ بیگم کے جانے کے بعد حکیم صاحب نے فوراً سیب کا مربّا کھایا کہ کہیں اُن کے دِل کی دھڑکن تیز نہ ہو گئی ہو۔

اور واقعی جس دِن سے نسیم وہاں آئی تھی پورے گھر کی فضا چہک اُٹھی تھی۔

جب حکیم صاحب خلوت گاہ میں پہلی مرتبہ نسیم سے ملے تو وہ بہت معصوم، شرمائی اور کم گو لگی تھی، اور جب خان صاحب نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا ہلکا سا دبایا تو وہ کیسے پسینے سے شرابور، سمٹ سی گئی تھی! وہ تو بھلا ہو روشن بیگم کا جنہوں نے یہ کہہ کر کہ "نسیم کو ابھی یہاں کی ہوا نہیں لگی، ذرا ہاتھ ہلکا رکھیں۔" اسے اندر کھینچ لیا تھا اور حکیم صاحب کے ہاتھوں میں صرف اُس کے لمس کی یاد ہی رہ گئی تھی۔

اور پھر حکیم صاحب کے زنان خانہ کا ماحول بدل گیا! جہاں پہلے عموماً روشن بیگم کے احکام اور کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دیتی تھی وہاں اب قہقہوں کی گونج اور پورا وقت کی کھسر پھسر حکیم صاحب کی آرام گاہ تک اکثر اور بعض اوقات دواخانہ تک بھی پہنچ

جاتی تھی۔ حکیم صاحب جو اب تک صرف روشن بیگم کی آواز کو ہی پہچانتے تھے اب اپنی دوسری دونوں بیگموں کو بھی ان کی ہنسی سے جانتے لگے تھے۔ گو انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر سے نسیم کی آواز کیوں نہیں آتی۔ بہر حال اگر نسیم بلند آواز نہیں بھی تھی تو زبان دراز ضرور ہوگی، کیونکہ دوسری بیگموں کی ہنسی سے یوں لگتا تھا جیسے اندر مسلسل کوئی دل لگی ہو رہی ہو۔

حکیم صاحب نے آئندہ چند ماہ میں بہت کوشش کی کہ نسیم کبھی اُن کے سامنے بھی زبان کھولے، مگر لگتا تھا گویا حکیم صاحب کی قربت میں اسے سانپ سونگھ جاتا ہو۔ چُپ چاپ، اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دئے، وہ سر جھکائے شرمائی ہوئی بیٹھی رہتی۔ حکیم صاحب کو اُس کی یہ حرکت چبھتی بھی اور بھاتی بھی تھی۔ ہر مرتبہ روشن بیگم نسیم کی کمسنی کا حوالہ دے کر اس کا چھٹکارہ کرواتیں۔ حکیم صاحب روشن بیگم کی بات مان تو لیتے مگر ان کی یہ خواہش بھی بڑھتی جاتی کہ کاش نسیم اُن کی موجودگی میں بھی کوئی زبان درازی کرے تاکہ وہ اپنی بیگمات کی ہنسی کا راز پا کر اُن کی شادمانی میں کم از کم دور سے ہی شرکت کر سکیں۔

وقت گزرتا رہا، اور حکیم صاحب اپنے گھر سے باہر کی شہرت پر ہی نیم مسرور زندگی گزارتے رہے۔ پھر ایک دِن جب ایک عمر رسیدہ اجنبی نے آکر انہیں بتایا کہ وہ روشن بیگم کے گاؤں سے ہے تو حکیم صاحب نے فوراً اُسے آنار کا شربت پلایا اور حال چال پوچھنے سے پہلے

آرام کے لئے اپنا بڑا کمرہ پیش کیا۔ بڑے میاں نے اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اُسے آرام کی تو ضرورت نہیں البتہ وہ حکیم صاحب سے ایک اور نوازش چاہے گا۔ حکیم صاحب نے مریضوں کا حوالہ دیتے ہوئے بزرگ سے کہا کہ اگر وہ کچھ دیر انتظار کر لیں تو بہتر ہو گا تاکہ وہ اپنے گاہکوں سے نبٹ کر انہیں صحیح توجہ دے سکیں۔ اتفاقاً روشن بیگم اُس شام بازار سے کپڑے خریدنے گئی ہوئی تھیں اس لئے وہ بھی بڑے میاں سے اپنے گذشتہ گھر کا حال نہ پوچھ سکیں۔

حکیم صاحب نے اُس شام دواخانہ ذرا جلدی بند کرنے کے بعد، آئے ہوئے مہمان کو ساتھ کے کباب خانہ سے کھانا منگوا کر پیش کیا اور زندگی کی ضروریات سے فارغ ہو کر اُس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

بڑے میاں نے روشن بیگم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے برس وہ اپنے گاؤں سے نسیم کے والدین کو یہ کہہ کر اُسے اپنے ساتھ لائیں تھیں کہ اب اُس کا گھر میں سختیوں کو جھیلنے کا وقت گزر چکا تھا اور اُسے وہاں سے باہر جا کر زندگی کے دوسرے نشیب و فراز سے گزرنا چاہئے۔

"بالکل"، حکیم صاحب نے اقرار کیا۔

"لیکن اُس کے بعد نسیم کی کوئی خبر نہیں آئی کہ اُس کا کیا ہُوا۔"

"ہونا کیا تھا! پکّی بات ہے کہ اگر روشن بیگم اُسے ساتھ لائیں تھیں تو نسیم کی زندگی بہت خوشی خوشی بسر ہو رہی ہو گی۔ آپ کیا تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ اپنے غریب ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، ظاہر ہے کہ پورے ایک برس سے کوئی خبر نہ آنے پر وہ پریشان ..."

"آپ کی مراد بیٹی کہنا تھی،" حکیم صاحب نے بڑے میاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں حکیم صاحب، میں نے بیٹا ہی کہا ہے۔ میں اس کے گاؤں کا جراح ہوں اور نسیم بیٹے کی مسلمانی تو میں نے خود اپنے ہاتھ سے کی تھی۔ وہ کچھ اکیہرے بدن کا لڑکا ہے اس لئے ذرا زنانہ لگتا ہے ورنہ تھا تو بہت شریر اور ایک زبردست بہروپیا۔ وہ تو بچپن میں قینچی سے کھیلتے ہوئے اس کی زبان کٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اب صحیح طرح سے بول نہیں پاتا ورنہ وہ تو..."

بڑے میاں نہ جانے کیا کیا کہتے رہے لیکن حکیم فضل اللہ خان صاحب بے خیالی میں اپنی تسبیح کے دانوں کو اُلٹا پھیرنے لگے — خان صاحب پر یہ راز کھُل چکا تھا کہ گھر میں ان کی بیگمات کی چہک کی وجہ نسیم کی زبان درازی نہیں تھی، بلکہ...

نجات

بابا چورنجی لال کو پہلی مرتبہ ہم نے ابّو کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ ایک مجسمہ کی مانند آنکھوں میں درد کا ساگر لئے، اپنا سانس روکے، بِلا آنکھ کی جھپک یا ہونٹوں کی جنبش کے انجن کے بند ہو جانے پر بھی اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ابّو نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر موٹر سائیکل سے اتارا تھا، اور اُسی طرح اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے سڑک کے پار رشید کرسیوں والے کی دکان کے پھٹّے پر بٹھانے کے بعد رشید سے چند منٹ باتیں کیں تھیں؛ اور پھر بابا چورنجی لال ہماری سڑک پر ہی مقیم ہو گیا۔

ابّو نے ہمیں گھر میں کچھ نہ بتایا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا اور کیوں؛ اور اُن سے خود کسی بات کے پوچھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ ہمارے گھر میں نام تو اللہ کا مگر حکم صرف ابّو کا چلتا تھا۔

درحقیقت ہمیں تو اُس کا نام تک معلوم نہیں تھا، صرف دوسروں سے سُنا تھا کہ وہ بھارت سے آیا ہے اور بہت دُکھی ہے۔ گو اُس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی، مگر کسی نہ کسی طرح اُس کا نام بابا چورنجی لال پڑ گیا تھا۔ اُن دنوں ویسے بھی بے شمار لوگوں کا انتقال

ہو رہا تھا۔ خبر تھی کہ ہر روز باڈر پرے کے سردار لاشوں سے بھری گاڑیاں لاہور سٹیشن بھیجتے ہیں جن میں سے کبھی کبھار کوئی زندہ روح بھی مِل جاتی ہے۔ اور وہ زندہ روحیں جن ظُلمات اور قتل و غارت کا ذکر کرتیں تھیں لگتا تھا کہ آئندہ گنگا جمنا میں صرف دُرگا کے پوجاری ہی اپنے کپڑے رنگ سکیں گے، مگر کوئی گیانی اُن میں اپنے کو پوتّر کرنے نہا نہ پائے گا! اسی لئے بابا چورنجی لال کا رشید کی دکان میں بس جانا کچھ عجیب نہ لگا۔ گو یہ اور بات ہے کہ پہلی رات ہی ہم سب کے دِل دہل کر رہ گئے تھے ... تمام دِن تو بابا چورنجی لال چُپ چاپ رشید کی دکان پر بیٹھا رہا تھا، لیکن جب رات پڑ گئی اور ٹیمپل روڈ کی سڑک پر میدھے کے ہوٹل کا مریل سا بلب ارد گِرد کی تاریکی کو ٹِڈّی پہلوان کی طرح مضحکہ خیز دھمکیاں دے رہا تھا تو لگا تھا کہ رشید کی دکان کے بند دروازوں کے پیچھے سے جہنم سے آئی ہوئی ہزار بدروحوں نے مِل کر چیخ ماری ہو۔ امّی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھٹ گیا اور نانی نے گھبرا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ اُس کے بعد یاد نہیں کب تک ایک بھیانک آواز نے دنیا اور دنیا والوں کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے وہ سب کچھ کیا جِس کو بیان کرنے کے لئے کوئی شریف صاحبِ لغت اپنی کتاب میں وہ استعمال کردہ الفاظ نہیں پا سکتا؛ گو، ہر بچّہ، جوان اور بوڑھا، عورت یا مرد جانتا ہے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا تھا!

رات گزر گئی۔ دِن چڑھنے پر میں نے سہمے سہمے کھڑکی سے سڑک کے پار دیکھا ...وہ شخص دکان کے باہر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا، اور

تمام دِن یوں ہی بیٹھا رہا۔ ابّو کے کہنے پر میں ترکاری کی ایک پلیٹ اور تندوری روٹی ڈرتے ڈرتے اُس کے پاس رکھ آیا تھا جسے اُس نے چھُوا تک نہیں۔ شام کو جب میں کھانے کی ایک نئی طشتری لئے اُس کے پاس گیا تو جلدی سے اُس کو وہاں رکھتے ہوئے اُسے کہا تھا "بابا جی! اِسے کھائیں، یہ ضروری ہے۔"

چند دِنوں کے گزرنے پر ہی بابا چورنجی لال نے رشید کی دکان پر کُرسیاں بنانی شروع کر دی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی اِس کام کو جانتا ہو گا، کیونکہ محض ایک چاقو کے لمس پر اُس کے مشّاق ہاتھوں میں بانس اور بید اپنا لباس یوں اتار دیا کرتے تھے جیسے کوئی معشوقہ ہجر کے طویل انتظار کے بعد سہاگ رات کو اپنے محبوب سے مِلاپ کے لئے اپنا بوجھ اتروا کر ہلکا محسوس کرنا چاہتی ہو۔ اُس کی انگلیاں اپنے رقص میں محو بید کی تیلیوں کا سر پکڑے انہیں کُرسی کے چوکھٹے کے اندر پروتی رہتیں اور دھیرے دھیرے کُرسی کی نشست تیار ہو جاتی۔ میرے لئے اُس کا اُن کُرسیوں کو بُننا کسی جادوگر کا عمل لگتا تھا اور میں کتنی کتنی دیر اُسے دیکھتا رہتا۔

میں نے ابھی تک اُسے کسی سے بولتے نہیں دیکھا تھا۔

سارا دن بابا چورنجی لال کُرسیاں بُنتا، لیکن رات کو جب وہ اپنے کو دکان کے کیواڑوں کے پیچھے بند کر لیتا اور اندھیرا رات بسر کرنے کے لئے شہر میں آ جاتا، تو کیواڑوں کی اوٹ سے گالیوں کی بوچھاڑ اٹھتی اور پورے محلے پر نازل ہو جاتی۔ اگر ہمارے علاقہ میں پہلے کسی کو

یہ غلط فہمی رہ چکی ہو کہ گالیاں صرف پنجابی ہی میں دی جا سکتی ہیں تو اب وہ سب اردو کے اِس غیر شناسا ادبی پہلو کے مکمل طور پر قائل ہو چکے تھے۔ سارا دن وہ چُپ کا مجسمہ، ظلمتِ شب میں ظالموں سے ایسے ایسے غلیظ اور ناجائز رشتے استوار کرتا تھا کہ نانی اماں کے کہنے کے مطابق "بیٹا، جِس نے اپنے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے آگے ذبح ہوتے دیکھا ہو، جِس کی بچیوں کو سکھوں نے اپنے گھر میں رکھا ہو اس کے منہ سے کوئی بُرا لفظ بُرا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ بابا نہیں بولتا، اُس کے اندر سے غصّے اور انتقام کا بھُوت چلاتا ہے۔" نانی اماں کو اِن تفصیلات کا کیسے پتہ چلا، کوئی نہیں جانتا تھا؛ لیکن اس میں کوئی شُبہ نہیں تھا کہ بابا چورنجی لال کے اندر سے ایک بھُوت چلاتا تھا کیونکہ اُس کی آواز میں جب الفاظ اپنا مطلب بیان کر چکتے تو تب بھی ایک غراہٹ، ایک کرب باقی رہ جاتا تھا جو شعور کی حدود سے گزر کر لاشعور میں اپنی دہشت پھیلاتا رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بابا چوربجی لال کی چیخ و پکار میں اتنا درد و قہر نہ ہوتا تو اُسے شروع سے ہی رشید کی دکان سے رخصت کر دیا جاتا؛ مگر اُس کی گالیوں کو اُس تقسیم میں ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف ایک اجتمائی احتجاج اور ردعمل سمجھا جاتا تھا اِس لئے کسی نے کبھی اُس سے پوچھا نہ تھا کہ وہ کیوں دنیا بھر کو گالیاں دیتا ہے۔ اور کوئی اُس سے پوچھتا بھی کیا، وہ تو دِن کی روشنی میں کبھی بولا ہی نہیں تھا! ویسے بے شمار قصّے چل پڑے تھے کہ وہ کون ہے اور بھارت میں کہاں سے آیا تھا؛ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ابّو کی موٹر سائیکل پر آیا تھا اور ابّو نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہے!

وقت گزرتا رہا، میں جوان ہو گیا اور بابا چورنجی لال بوڑھا، مگر جو چیز نہ بدلی وہ اُس کی ہر رات کی گردان تھی۔

پھر ایک شب جب رات کی دیوی اپنے پورے لشکر کے ساتھ شہر پر حملہ آور ہوئی تو تمام محلہ منتظر رہا کہ بابا چورنجی لال کسی بھی لمحے اُس سیاہی بھرے سکوت کو اپنی چیخ سے کاٹ کر رات کے سپاہیوں سے گھمسان کا رن ڈالے گا۔ ساری رات میں نے اُس جنگ کے انتظار میں کروٹیں لیں اور صبح ہوتے ہی رشید سے بابا چورنجی لال کی صحت کا پوچھا۔

"بابو جی، بابا کی صحت کو کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کے اندر تو نفرت کی بھٹی جلتی ہے کوئی جراثیم بھی اُس کے قریب نہیں پھٹکتا۔"

"تو پھر رات بھر خاموشی کیوں رہی؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"وہ چلا گیا یہاں سے۔"

"چلا گیا؟"

"جی، وہ نیا تھانیدار آیا ہے جی، اُس نے کل رات بابا چورنجی لال اور اُس کا جو تھوڑا بہت سامان تھا اسے اٹھوا کر اچھرے کے پاس والی جھگیوں میں بھجوا دیا۔"

میرا دِل بہت چاہا تھا کہ ابّو سے کہوں کہ وہ بابا کو واپس بلوا لیں، لیکن حسبِ معمول اپنے دِل کی بات انہیں کہہ نہ سکا؛ اور نہ ہی انہوں نے خود بابا کے غائب ہوجانے پر کوئی تجسس ظاہر کیا۔ ہو سکتا ہے کہ

تھانیدار نے اُن کے کہنے پر ہی بابا چورنجی لال کے کُوچ کا احتمام کیا ہو!

بابا چلا گیا، اُس کی یاد میرے پاس رہ گئی۔ کتنی مرتبہ میں نے سوچا تھا کہ اُس سے پوچھتا کہ وہ کہاں سے آیا تھا، اُس سے کیا ہُوا تھا، وہ کون تھے جنہوں نے ....! اُن چند برسوں میں نامعلوم کتنی مرتبہ میں اُس کے قریب بیٹھا تھا اور وہ میری موجودگی سے لاپرواہ اپنے کام میں مگن رہا۔ شاید اگر میں اُس سے پوچھتا تو وہ جواب دے ہی دیتا؟ لیکن اُس خاموشی میں بھی ہمارے درمیان ایک ابلاغ کی ندی بہتی رہی۔ بِلا کسی تصدیق کے بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ اُسے میرا اُس کے پاس بیٹھنا بھلا لگتا تھا۔ اُس کی تنہا ذات کے لئے میں ایک ایسا سفینہ تھا جو کبھی کبھی اسے چُپ کے سمندر پار چلنے کی دعوت دیا کرتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اُس نے کبھی اُس سفینہ میں قدم نہ رکھا ہو۔

پھر ایک دِن میں بھی چلا آیا ... اچھرے کی جانب نہیں، بلکہ اچھرے سے بہت دور --- لندن کی طرف۔ لندن سے کبھی یہاں اور کبھی وہاں؛ اور پھر سویڈن پہنچ کر ٹھہر گیا۔

سال گزرتے رہے۔ ویت نام سے جلتے بچوں کی تصاویر دیکھیں، بیافراہ سے کچلے بچوں کی تصاویر دیکھیں، کمبوڈیا سے بِنا ماس کے ڈھانچوں کی تصاویر آئیں، کونگو سے بِلا سر کے دھڑوں کی تصاویر آئیں،

عراق سے زندہ مدفون جوانوں کی خبر آئی، بوسنیا سے بن ماں باپ کے بچوں کے قافلے مہاجر بن کر آئے۔ جب کبھی، جہاں کہیں بھی کوئی درد بھری آواز آئی بابا چورنجی لال کی ہلکی سی یاد بھی ساتھ لائی!

میں اِس دوران میں مختلف استادوں کی شاگردی اور کتابوں کی ورق گردانی کر کرا کے ماہر نفسیات کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایک ہسپتال میں ڈاکٹر کے عہدے پر لگا ہوا تھا۔ ایک روز جب میں رات کی ڈیوٹی پر تھا تو مجھے بوسنیا سے آئے ہوئے ایک مریض سے ملنا تھا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو پہلے نرس سے ملا تاکہ مریض کے معاینے سے پہلے اُس کے متعلق کچھ جان سکوں۔

"وہ کچھ بھی نہیں بولتا، صرف سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔" کارن نے مجھے کہا۔

"کچھ نہ کچھ تو اُس نے کہا ہو گا؟"

"ایک لفظ بھی نہیں، صرف اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی مقدار بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔"

معاینہ کے کمرے میں ایک بڑے میاں بُت بنے بیٹھے تھے۔ میں نے مختلف طریقوں سے اُن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ صرف سر جھکائے بیٹھے رہے۔ آخر ہار کر میں نے اُنہیں تنہا چھوڑ دیا کہ شاید کچھ خود کلامی کے بعد وہ گفتگو پر راضی ہو جائیں۔ میں ساتھ والے کمرے میں بیٹھا کارن کے ساتھ دوسرے مریضوں کے متعلق بات چیت کر رہا تھا جب قریب سے ہی ایک دِلخراش چیخ اٹھی۔ کارن کے ہاتھ میں پکڑی فائل نیچے گر گئی اور میرا دِل چاہا کہ کاش کہ نانی اماں وہاں

ہوتیں اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیتیں!

میرے چہرے پر ضرور ہلدی کا لیپ نظر آ رہا ہو گا، تبھی تو کارن نے مجھے پوچھا "ڈاکٹر! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

میں نے زبردستی سے ایک مسکراہٹ کو اپنے چہرے پر بلایا، جلدی سے ساتھ کے کمرے میں گیا جہاں وہ بڈھا اپنی چیخوں سے دنیا بھر کی ملامت کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی جس میں زمین پر گِرے پڑے سات آٹھ افراد اپنے خالق کو پیارے ہو چکے تھے، گو ان کے خون آلودہ دھڑوں کی حالت سے لگتا تھا کہ انہوں نے وہ سفرِ وصل خود اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اُن کی مرضی کے خلاف کسی اور نے گولی اور بندوق کی مدد سے انہیں رخصت کیا ہو۔

بڑھے میاں کو تو نرسوں نے ٹیکہ لگا کر سُلا دیا، لیکن میری یاد میں جاگے ہوئے بابا چورنجی لال کو کون سُلاتا!

بوسنیا کے مظلوم کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر نے مجھے کافی حد تک بتا دیا تھا کہ اُس سے کیا ہوا، بھارت سے آئے ہوئے اُس مظلوم کے ذہن کی تصاویر کے متعلق کون کیا جانتا تھا؟؟

ایک دو روز کی شب خرابی نے مجھے برسوں بعد لاہور بھیج دیا۔

پہلے چند دِن تو ضروری لوازمات میں گزر گئے، پھر میں اُس جگہ گیا جہاں مزنگ کا پچھلے پچاس برس کا علم محفوظ ہو سکتا تھا — میدھے کا ہوٹل!

وہاں پہنچا تو یہاقو نے پہلی نظر میں ہی مجھے پہچان لیا۔ ہم دونوں گلے مِلنے کے بعد چند منٹ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے آنسو بھری

آنکھوں سے دِلوں کی بات کرتے رہے۔ جب دِل بھر گئے تو لب ہلے؛ پتہ چلا کر ہر وہ دوست جو کبھی میرے ساتھ ٹمپل روڈ کی سڑک پر کبڈی کھیلا کرتا تھا یا تو مر چکا ہے، شہر چھوڑ چکا ہے یا کسی جرم کی سزا میں اندر ہے۔ یہاقو نے بِلا پوچھے ہی مجھے میری پسندیدہ چائے اور مکھن بند بنا کر دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے یہاقو سے پوچھا "وہ بابا چورنجی لال ہُوا کرتا تھا، معلوم ہے اُس کی قبر کہاں ہے؟"

"اُس پاگل کی قبر؟ اُس کمبخت کا سانس رُکے تو اُس کی قبر بھی بنے۔"

"وہ ابھی زندہ ہے؟" میرے ہونٹوں سے یہ سوال خود بخود نِکلا۔

"کم از کم نوّے برس کا ہوگا، لیکن اب بھی کبھی کبھی چائے پینے آجاتا ہے۔"

"کچھ پتا چلا کہ اُس سے کیا ہُوا تھا؟"

"کچھ بولے تو معلوم ہو۔ وہ تو صرف رات کے اندھیرے میں بولتا ہے اور وہ بھی اندر سے کُٹیا کا پردہ گِرا کر! اور وہ جو کہتا ہے وہ تمہیں آج بھی یاد ہوگا۔"

"اسی طرح؟"

"سنا ہے اُس سے زیادہ زور لگا کر۔" یہاقو نے جواب دیا۔

"کیا اُن ہی کُٹیوں میں رہتا ہے؟"

"ہاں اُن ہی کُٹیوں میں، مگر اُس جگہ پر نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"لالہ! جب شہر میں پیسے والوں کے پاس جگہ کم پڑ جائے تو وہ

کٹیوں والوں سے اُن کی زمین چھین کر انہیں کچھ دُور پرے دھکیل دیتے ہیں۔"

"تو کہاں رہتا ہے وہ اب؟"

"اچھرے کے پار، ماڈل ٹاؤن سے چند میل پرے ایک آبادی ہے، سنا ہے وہاں ہی رہتا ہے۔ اِن بیچاروں کو آج تک کسی نے خط تو لکھا نہیں اس لئے کوئی پتہ وغیرہ بھی نہیں۔ لیکن اگر تم رات کے اندھیرے میں اُدھر جاؤ تو کٹیا ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔"

"بابا کی آواز مجھے خود ہی کھینچ لے گی،" میرے منہ سے نِکلا۔

اُس رات میں ٹیکسی کی مدد سے یہاقو کے بتائے ہوئے علاقہ میں پہنچا اور ٹیکسی کو انتظار کرنے کا کہہ کر اترنے لگا۔

"بابو، اگر بُرا نہ مانو تو میں ساتھ چلوں۔ یہ علاقہ کچھ اتنا اچھا نہیں،" ٹیکسی بان نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں گاڑی سے باہر نکلے۔ میں ابھی باہر کھڑا فضا میں تعفّن کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اُس مخصوص آواز میں زبان کے تعفّن کی دھیمی دھیمی سی خبر آئی۔ میرے قدم بے اختیار اُس آواز کی سمت میں اُٹھ گئے۔ کٹیا کے باہر آکر ہم رکے۔ بابا چورنجی لال دِل لگا کر سب کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ لفظی زیادتی کر رہا تھا۔ گو عمر کی پرواز نے اُس کی آواز میں کچھ لرزش پیدا کر دی تھی، مگر سال ہا سال کی ریاضت نے اُس کے لہجے کو پختگی بھی بخشی تھی! میں

نے دائیں بائیں دیکھ کر اُس کی کُٹیا کے مقام کا تعیّن کیا اور پھر ٹیکسی کی جانب لوٹا۔ ٹیکسی بان اور میں چُپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئے؛ لیکن گاڑی چلانے کی بجائے وہ ساکن بیٹھا رہا، پھر تعجب بھری آواز میں کہنے لگا:

"صاحب! اگر گالیاں ہی سننی تھیں تو اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی، اندرون شہر چلتے، پوری خلقت ہی اپنے سیاست دانوں کو، چاہے وہ بیگم صاحبہ کے فرشی حقّے ہوں یا بٹ صاحب کے چمچے، یوں ہی گالیاں بکتی ہے۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا، اگرچہ مجھے یقین تھا کہ شہر کی خلقت کی بدزبانی کی وجہ بھی اتنی ہی سچی ہو گی جتنی بابا چورنجی لال کا درد — چند دِنوں کا شہر میں پھرنا مجھے بہت کچھ بتا چُکا تھا۔

اگلے روز بہت خوش گوار موسم تھا۔ میں دس بجے کے قریب بابا چورنجی لال کی کُٹیا کے باہر پہنچا۔ سفید بال اور جھریوں بھرا بدن ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو مقیّد کئے کُٹیا کے باہر ایک صف پر دھوپ میں بیٹھا ہُوا تھا۔ میں اپنے پہلے والے انداز میں اُس سے کچھ فاصلے پر اُس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ چند متجسس بچّے ہمیں مسکراتی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہماری ہر طرف مختلف آوازیں اٹھ رہی تھی مگر ہمارے درمیان مکمل سکوت کا راج تھا۔

"آپ نے بھی بالوں میں چاندی بھر لی؟" تقریباً پچاس برس بعد میں نے دِن کی روشنی میں بابا چورنجی لال کی آواز سنی۔

میں نے گھوم کر اُس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔

"حیران نہ ہو گھگو میاں کہ میں آپ کو پہچان گیا! آپ کے علاوہ آج تک کوئی میرے قریب اس طرح نہیں بیٹھا۔" بابا نے میرے بچپن کا نام استعمال کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا تھا۔

میں پھر بھی چُپ رہا، مگر لگتا تھا وہ میرے خیالات پڑھ رہا ہو،

"آج آپ کرسی بُنتی تو دیکھنے آئے نہیں ہوں گے؟" اُس کی پانی بھری آنکھوں نے میرا مکمل جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بابا جی..."

"بابا چورنجی لال کہیے... یہ نام آپ نے ہی مجھے دیا تھا۔" بابا نے میرے اپنے ہی دِل کے چور کا مجھ پر انکشاف کیا۔

"بابا جی؛" میں نے اپنی آواز میں احترام کا درجہ بڑھاتے ہوئے اُسے کہا۔

"بولیں،"

"میں بچپن سے اپنے دماغ میں چند سوالات کی گٹھری اٹھائے پھر رہا ہوں اور صرف آپ ہی مجھے اُس سے نجات دِلا سکتے ہیں۔"

ایک طویل خاموشی نے ہم کو گھیر لیا۔ لگتا تھا کہ وہ فیصلہ کر رہا ہو کہ وہ آج کتنا بولے گا! پھر اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا "پُوچھیں۔"

"آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، آپ کے ساتھ کیا ہُوا؟"

"ایک ایک سوال کریں تو میں آپ کی بہتر تسکین کر سکوں گا۔"

"جتنا بھی آپ کو یاد ہو..."

"یاد ہی تو میرا وہ خزانہ ہے جسے میں نے آج تک نہیں بانٹا! سو

پُوچھیں، مجھے سب یاد ہے۔"

"آپ بھارت میں کہاں سے آئے تھے؟"

"بھارت سے؟ میں بھارت سے نہیں آیا تھا۔"

"جی؟"

"میں بھارت سے نہیں آیا تھا، میں تو لاہور کے ایک علاقہ رام گڑھ کا رہنے والا تھا۔"

میرے ذہن میں بیک وقت ہزاروں سوال اُٹھ رہے تھے لیکن کوئی بھی زبان تک نہیں آنا چاہتا تھا۔

"آپ چُپ کیوں ہو گئے، گُھگو میاں؟"

"میرا نام گُھگو آپ کو کِس نے بتایا؟"

"کرِشن نے۔" بابا نے جواب دیا۔

"کرِشن نے؟"

"جی کرِشن نے۔ کیا آپ کو کرِشن یاد نہیں، وہ ہر صبح آپ کو سائیکل پر سکول لے کر جاتا تھا؟"

میری آنکھوں میں سائیکل پر ایک دھندیالے سے سائے کی تصویر ابھری۔ اُس سائے کے پیچھے ایک اور چھوٹا سا سایہ سائیکل پر بیٹھا ہُوا تھا — وہ سایہ میں ہو سکتا تھا۔

"میں کرِشن کا پِتا ہوں۔" مجھے ایک آواز نے ماضی سے کھینچا۔

"کرِشن کا کیا ہُوا؟" بے ربط سے سوال میری زبان پر آنے شروع ہوئے۔

"بھینٹ چڑھ گیا تھا۔"

"کِس کی بھینٹ، بابا؟"

"بھگوان کی! بھگوان ہی تو زندگی دیتا اور لیتا ہے۔"

"کیسے؟"

"کچھ دھندیالی سی یادیں ہیں۔ بہت شور تھا اُس دِن۔ ہمارے گھر کے باہر لوگوں کا مجمع تھااور بہت غیر مانوس سی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اور میرا چھوٹا بیٹا موہن گھر کے باہر ایک ہجوم میں کھڑے تھے جب داروغہ صاحب کرِشن کو اپنی پھٹ پھٹ کے پیچھے بیٹھا کر لائے تھے۔ مجھے اور موہن کو دیکھتے ہی کہنے لگے "چلو! میں تم ہی کو لینے آیا ہوں۔"

"انہیں کہاں لے جاؤگے داروغہ صاحب؟ اب یہ یہاں ہی رہیں گے۔" کسی غضب دار آواز نے کہا تھا۔

پھر انہوں نے کرِشن کو پھٹ پھٹ سے کھینچ لیا تھا۔ وہ زمین پر گِر گیا، موہن کو بھی گِرا دیا گیا۔

"یہ لڑکے تو اپنے ہیں۔" داروغہ صاحب نے چلا کر کہا تھا۔

"اگر ہمدردی دکھانی ہے تو باڈر پار جا کر اُن لوگوں کے لئے دکھائیں جن کے نام ہمارے نام سے ملتے ہیں، داروغہ جی۔"

"رام کا کام تمام کرو۔" ایک اور گرج آئی۔

"یہ لڑکے تو اپنے ہیں،" داروغہ صاحب نے پھر چلا کر کہا۔

پھر اُن کی چیخ اُن سے اونچی چیخوں میں ڈوب گئی۔

"کرِشن اور موہن کو آپ کے سامنے قتل کر دیا گیا؟"

"کر دیا گیا ہوگا! میری آنکھوں نے شاید دیکھا ہو اور کانوں نے

سُنا بھی لیکن ذہن میں اُن دونوں کی کوئی تصویر محفوظ نہیں ! میں تو حیرت بھری آنکھوں سے اُس ہستی کو دیکھتا رہا تھا جس کے چہرے پر جلال، آنکھ میں قہر، بدن پر سفید پوشاک اور ہاتھ میں چمکتا ہُوا خنجر تھا۔ لگتا تھا شِیو مہاراج کسی راکشس کے بھیس میں راکشوں کے لشکر سمیت خود موجود ہوں۔ کِس طرح وہ خنجر سمیت ہاتھ اٹھاتے تھے، پھر وہ ہاتھ گِرتا، دھپ کی آواز آتی اور سرخ رنگ کے دھبے اُس سفید لباس کو رنگ دیتے۔ لگتا تھا خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہو۔ کیسے ہر دھپ کے ساتھ ہی لال چھینٹیں اٹھتی تھیں اور اُن کی آنکھوں کی جِلا بڑھ جاتی! کتنے سفید دانت تھے اُن کے! آج تک سمجھ نہ آئی کہ شِیو جی اور اُن کے ساتھیوں کے منہ سے "علی حیدر" اور "اللہ اکبر" کے نعرے کیوں نکل رہے تھے! اُس دِن بھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔"

بابا اچانک ماضی کی دنیا میں گم ہو گیا۔

"ابّو نے کچھ اور نہیں کیا تھا؟" میں نے بابا کو واپس بلایا۔

"کیا کرتے داروغہ جی؟ ایک چاقو اُن کی ناف پر اور دوسرا اُن کی گردن پر دھرا ہُوا تھا۔ اُن کے ہونٹ تو ہِل رہے تھے مگر کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، کچھ نہیں۔ جب ہر شے سرخ ہو گئی تو اچانک سب جانے لگے۔ "میری بھی تو بھینٹ لے لیں سرکار، میرے بیٹے تو آپ نے لے ہی لئے۔" میں گِڑگڑایا تھا۔

یکایک کسی نے میری کمر پر خوب زور سے ٹھُڈا مارتے ہُوئے کہا

تھا "خبیث بڈھے! تجھے ہم صرف اِس لئے چھوڑ رہے ہیں تاکہ تو واہگہ پار جا کر اُن کافروں کو بتا دے کہ ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔"

پھر داروغہ صاحب اپنی پھٹ پھٹ پر اور میں اپنے گھٹنوں پر بیٹھے رہ گئے تھے۔

کچھ دیر بعد داروغہ جی اترے اور مجھے کہنے لگے "رام داس، اِن بدقسمتوں کو اب یہاں ہی رہنے دو، اور خود میرے ساتھ چلو۔ میرے محلہ میں رہنا۔"

"میں اب جی کر کیا کروں گا، انہوں نے میری بھینٹ قبول کیوں نہ کی، داروغہ جی؟" میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بہت آہستہ سے بولے تھے "شاید اس لئے باپو کہ ہم سب کی نجات اب تمہارے بس میں ہی ہے۔"

"میرے بس میں آپ سب کی نجات، داروغہ جی! آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے لئے دعائیں مانگوں؟" میں نے ہاتھ باندھے پوچھا تھا۔

"نہیں، رام داس! اب دعا سے کام نہیں چلے گا۔" پھر انہوں نے سر جھکاتے ہوئے کہا تھا، "جب تک یہ سانس چلتا رہے، جہاں بھی رہو، ہم سب کو گالیاں دیتے رہنا۔"

سراب

گرمیوں کی چھٹیوں میں نورمیر لارستراند ہماری پسندیدہ جگہ تھی — ہم وہاں گھنٹوں بیٹھ اور لیٹ کر سبزے اور پانی کے پار ٹاؤن ہال کی عمارت کو گھُورا کرتے تھے۔ اتنے فاصلے سے اُس عمارت میں تو دیکھنے کے قابل کوئی شے نظر نہیں آتی تھی؛ لیکن جھیل کا سلیٹی پانی اُن نرم، گرم اور دودھیا پستانوں کے لئے، جو سینکڑوں سویڈش اور دوسری سیاح لڑکیاں ہر دوپہر ہری بھری گھاس پر لیٹی خورشید کی پرستش کرنے اور آفتابی شعاؤں کو اپنے بدن میں جذب کرتے ہوئے انہیں پوشاک کی گرفت سے آزادی دینے کے بعد ہوا کے ملائم ہاتھوں میں مالش کے لئے کھلا چھوڑ کر آرام کرتی تھیں، ایک ناقابل فراموش سینہ مہیا کرتا تھا۔

یہ کچھ ایسا فردوسی ماحول لگتا تھا کہ حاجی صاحب جب بھی کبھی سویڈن کا رُخ کرتے وہ ہمیں ادھر کی سیر کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے معمول سے ذرا جلدی گھر سے نکلنے کو کہتے، "برخودار، ہمیں وقت پر وہاں پہنچ کر گھاس کی نمی اور سبزے کا فائدہ اٹھانا چاہئے تاکہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے۔ بعد میں تو ہجوم ہو جاتا ہے اور عجیب عجیب قسم کے فضول لوگ آ کر آنکھوں میں چبھتے ہیں" — فضول لوگوں

سے اُن کا اشارہ اُن لمبے تڑنگے سویڈش مردوں کی طرف ہوتا تھا جو اپنی سہیلیوں یا بیویوں کی رفاقت میں خوش خوش بیٹھے نازک گھاس پر بوجھ اور دوسرے غاصب فطرت افراد کی راہ میں بطور خار نظر آتے تھے۔ اگر یہ بڑے چوہدری صاحب کا زمانہ ہوتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے ان سب جوانوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے انہیں کسی جہاد پر بھیج کر خود نکاح کی بندش کو بھی معتّل کرنے کے بعد ساری رولامز پارک کو اپنا حرم قرار دے دیتے، لیکن یہ سویڈش معاشرہ اُس جنسی بھوک کے دور سے بہت آگے گزر چکا تھا جب محض پردہ اُٹھا کر کسی کا چہرہ دیکھ لینا ہی اتنا ہیجان انگیز ہوتا تھا کہ دیکھنے والے کے لئے فوراً اپنے گھر لوٹ کر اپنا لاوہ اُگلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا ہو۔ یہاں تو دل اپنا، بدن اپنا، پسند اپنی کے اصول کو اپنا کر قابلِ وصل بھی وہی فرد سمجھا جاتا ہے جس کو خود اپنا دل و دماغ قبول کرے؛ نہ کہ ایک فرضی آسمان سے اترے، زمین پر گھڑے، فرمانوں کی اندھی تابعداری جو حاجی صاحب کے وطن کے تجارتی معاشرہ میں اکثر فرماں بردار شرمیلی دلہنوں کے لئے شبِ عروسی کے دوران جماع بالجبر سے ملتے جُلتے حالات پیدا کرتی ہے!

خود حاجی صاحب کا اصرار تھا کہ وہ وہاں تسکینِ چشم نہیں بلکہ راحتِ قلب کے لئے آتے ہیں، کیونکہ زمین پر بکھرے وہ تھرتھراتے بیضوی جوڑے انہیں ہمیشہ تاج محل کے سنگ مرمری گنبد کی یاد دلاتے تھے؛ لیکن ہمیں یوں لگتا تھا کہ وہ آنکھیں میچ کر اپنی خواہشات کے پردے پر جنت کی اُن حوروں کی تصاویر ابھارنے کی کوشش کرتے

رہتے ہیں جو انہیں دہر کے گنبدِ بے در کے نیچے یہ کھلی پڑیں خوشیاں
ٹھکرا دینے پر انعام میں ملیں گی۔

حاجی صاحب، چند برس پہلے، سویڈن میں پہلی مرتبہ اپنے طلاق یافتہ بیٹے کے پاس اپنے دل کے بائی پاس آپریشن کے بعد تشریف لائے تھے۔ "اس بے حیا قوم کے متعلق بہت کچھ سُن رکھا تھا، سوچا کہ سفرِ آخر سے پہلے ایک نظر ادھر بھی ڈالتا جاؤں تاکہ حسرت نہ رہ جائے کہ میں راہِ حیات کے تمام اُنچے نیچے راستوں سے نہیں گزرا" یہ اُن کا ہمارے سے پہلا تعارف تھا۔ اُن کی شخصیت بھی عجیب تھی — چہرے پر اگی بھرپور داڑھی انہیں ایک پراسرار قسم کی بزرگی بخشتی تھی مگر آنکھوں میں پڑے سرمے کی لکیر ان کی رنگین مزاجی کی نشان دہی کرتی تھی۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کوئی شوقین نقابِ ریش تلے چھپا بیٹھا ہے یا کوئی بزرگ ابھی بھی اپنی جوانی کی امنگوں کو دل میں لئے پھرتا ہے!

بہرحال، اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس بے حیا قوم سے چشمی قربت کے بعد حاجی صاحب ہر ممکن کوشش کر رہے تھا کہ اُن کے سفرِ آخر کے آغاز میں تاخیر اور ان کے بصری مشاہدے کی طوالت برقرار رہے۔ اِس لئے وہ باقاعدگی سے اپنے ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات کا خیال رکھتے — نیند پوری لیتے، کھانے میں پرہیز کرتے، مختلف ادویات وقت پر کھاتے اور ہوا کی تبدیلی کے لئے ہر سال جون کے مہینے میں سویڈن وارد ہوتے۔ سویڈن میں روایتاً کہا جاتا ہے کہ جب درخت اپنے لباس پہننا اور لڑکیاں اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دیں تو مئی کا مہینہ

آ جاتا ہے، جون میں سب شجر ملبوس اور گوریاں عریاں نظر آتی ہیں، جولائی میں جھیلوں اور سمندر کے پاس نیم گرم ریت کم اور دہکتا ماس زیادہ دکھائی دیتا ہے، اور پھر آگست میں پتے اور بدن دونوں اپنی جلد میں پیتل کی رنگت بھرنی شروع کر دیتے ہیں — لیکن یہ سب کچھ تب ہی ہوتا ہے جب ان مہینوں میں سورج دیوتا انہیں اپنا درشن دینے پر رضامند ہوں، ورنہ بے ثمر درخت اور غاروں کے مقیم اپنے کمروں میں بند کھڑکیوں کے پیچھے سے اداس نظروں کے ساتھ ان پرندوں اور دوستوں کے جہازوں کو دیکھتے رہتے ہیں جو گرم ملکوں کی طرف اپنی پرواز کا رخ کئے ہوں۔

یہ دوپہر بھی ان ہی سنہری دوپہروں میں سے ایک تھی جب خالقِ عالم اپنی تخلیق کردہ خلقت میں سے ہاتھ باندھے، سر جھکائی محفل سے اُکتا جانے پر اُن سے نظر بچا کر سینہ تانے، چشمِ بے خوف والی مخلوق کے درمیان بیٹھنے کے لئے خود عرش سے فرش پر جانے کا خواہش مند ہو سکتا ہو! ایسی ایسی ہستیاں ہمارے آگے پیچھے، دائیں باہیں اُٹھ، بیٹھ اور لیٹ رہی تھیں کہ خود بخود دِل سے دعا اُٹھتی تھی کہ "مولا! دنیا بھر کی کپڑے بنانے والی مشینوں پر ریت کی بارش کر، یا کم از کم ان پر کام کرنے والے مزدوروں پر من و سلویٰ نازل کر کے انہیں عرصہِ طویل کے لئے شوقِ ہڑتال سے نواز۔" خود حاجی صاحب، جو عموماً اِس برہنگی کے سمندر میں اپنے عقائد کی کشتی کو سطحِ یقین پر تیرتا رکھنے کے لئے اپنی زبان کا چپّو نامحرم سینوں کی ابھرتی ڈھلتی لہروں پر بے دھڑک

مارا کرتے تھے، اس روز اُف اُف کی بجائے واہ واہ پر مصر تھے۔ صرف وسیم صاحب کچھ دھیمے موڈ میں تھے۔ ہمارے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ کل رات المپک کھیلوں کے اختتام کے فوراً بعد سے وہ شدید مایوسی کا شکار ہو گئے۔

"اس مرتبہ تو ہمارا کوئی کھلاڑی فائنلز میں پیچھے سے بھی فرسٹ نہیں آیا۔ چالیس چالیس لاکھ افراد کی قوموں نے بھی دو دو سو سے زیادہ کھلاڑی بھیجے تھے، اور ایک ہم ہیں کہ تیرہ کروڑ میں سے صرف تیس شراکین، جس میں چودہ کھلاڑی اور سولہ تماشائی شامل تھے، سبز پرچم کے تلے نامرادی کی لاش لئے پھر رہے تھے۔"

"صاحب، جب کبھی بھی ہماری ثقافت کے مطابق کھیلوں کا مقابلہ ہُوا تو دیکھنا ہم ہی ہم ہوں گے" ارشد جمال نے اپنی کھنک دار آواز میں کہا۔

"بھئی وہ کون سے کھیل ہیں؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"پشت نمائی اور سر جھکائی کے مقابلے، سائیں جی؛ اور کونسے؟ صدیوں کا تجربہ ہے ہمارا! ایسے ایسے تنومند اور کڑیل جوان ہیں ہمارے کہ انہیں دور سے دیکھنے پر خوف آتا ہے، اور ادھر سے کوئی چابک والا اپنا ہاتھ ہلائے تو سب کے سب یوں دُم دبا کر کھڑے ہو جاتے ہیں گویا سدھائے ہوئے کتّے ہوں۔ ڈنڈے والے کے ایسے وفادار کہ وہ جب چاہے کمزور سے زیادتی کروا لے۔ اور کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مظلوم غیر ہوں یا اپنے؛ آنکھ کے اشارہ پر ہر کسی کی عزت لوٹ سکتے ہیں، خاص طور پر اپنوں کی۔ جانتے ہیں آپ کہ ایسا کیوں ہے؟" ارشد کو

میں نے کبھی پہلے اس مزاج میں نہیں دیکھا تھا۔ غصّہ سے تھوک کی جھاگ اُس کی باچھوں کے گِرد نظر آ رہی تھی۔

"کیوں؟" یہ بھی میرے منہ سے بے اختیار ہی نِکلا۔

"انسانی فکر اور وقار کا فقدان! ہماری پوری قوم خود اپنی نفی ہے — جِس زمین سے کھاتے ہیں اُسے ایک ریتلے، بنجر صحرا کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں، جِس پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اُسے آدھا انسان قرار دیتے ہیں، جِس تہذیب سے ہمارا وجود پھولا پھلا اُسے اجنبی احادیث کے سامنے جھوٹا مانتے ہیں؛ ہونا تو یہ چاہئے کہ جِس دھرتی سے کھائیں اُسے اپنے پیار سے سینچیں، جِس پیٹ سے جنم لیں اُس کی اچھائیوں کو دِل سے پوجیں اور جس تہذیب سے ہمارا خمیر اُٹھا ہو اُس کی خوبیوں کا دنیا میں پرچار کریں ۔ آپ بتائیں وہ اقوام جو ہمارے بچّوں کو جانوروں سے کمتر سمجھ کر انہیں اپنی تفریح کے دوران اونٹوں کے پاؤں تلے کچلوانے سے گریز نہ کریں، ہماری بچّیوں کو زبردستی بطور داشہ استعمال کریں، ہمارے جوانوں کے ساتھ عہد قدیم کے غلاموں سے بھی بدتر سلوک کریں، ہم ان ہی اقوام کی ایک ایک عمارت کے لئے اپنے سارے گھر گروا سکتے ہیں، اُن کی جان کی حفاظت کے لئے اپنے سینکڑوں بیٹے مروا سکتے ہیں تو پھر ہمارے بچّے کس ملک، قوم یا پرچم کے لئے دنیا کے دوسرے جوانوں سے مقابلہ کریں گے؟ اُن کے پاس سر اٹھانے اور سینہ تاننے کے لئے کچھ تو ہو جو دوسرں کی طرح بلند ہو! آپ ..."

"ارشد! کس چکر میں پڑ گئے یار؟ دائیں دیکھو، بائیں دیکھو، باغِ بہشت میں بیٹھے ہو، کیوں یہاں دِل جلانے کی باتیں کرتے ہو؟"

"سائیں جی! اس باغِ بہشت کو دیکھ کر ہی تو دل جلتا ہے... اِس باغ سے نہیں، اِس کے برعکس کے تصوّر سے! جانتے ہیں کہ یہی عورتیں وہاں بھی ہیں جنہیں ہم مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے کو سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر رکھیں لیکن یہاں پر یہ صرف ایک رومال باندھ کر کیوں بے خوف و خطر لیٹی ہیں، اور ہر وہ جابر جو اُنہیں وہاں کوڑے مارنے کو تیار ہے اُس کی یہاں اتنی مجال نہیں کہ اِن سے اونچی آواز میں بات تک کر سکے؟ ہمارے مرحوم امیرالمومنین اپنے ملک میں قدرت کے بنائے ہوئے ان کرشموں پر پردہ ڈلوا کر خود ہاتھ میں کشکول پکڑے مارگریٹ تھیچر، جسے اُس کی پارٹی والے آہنی فوطوں والی میگی کہتے تھے، کے گھٹنوں کے پاس سر رکھے اس سے معاشی اور اسلحہ کے اترن کی بھیک مانگتے تھے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ وہاں عورت کا سر جھکوانے والے پُرتکبّر مرد خود مغرب کی عورتوں، چاہے وہ ملک کی وزیر اعظم ہو یا کسی سوشل مدد کرنے والے دفتر کی کلرک، کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہی؟ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورت اور مرد کا امتیاز صرف بستر تک محدود ہے، بستر سے باہر یہ سب اُس قوم کے خوداختیار اور معاشی طور پر آزاد افراد ہیں جو صرف نوّے لاکھ کی آبادی سے یورپ میں رقبہ کے لحاظ سے تیسرے سب سے بڑے ملک کے مالک ہیں۔ یہاں ہر کوشش کی جاتی ہے کہ ایک دوسرے کا ایک منتظم طریقہ سے خیال کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس معاشرے میں مکمل انسانی مُساوات کا راج ہے، مگر یہ لوگ اُس منزل کی طرف نہ صرف گامزن ہیں بلکہ اُس کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں؛ گو یہاں بھی نسل

پرست اور شرانگیز شخص پائے جاتے ہیں۔ اِن کے حکومتی افسران کے حکمران نہیں بلکہ نوکر سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے حرامی حکمران اُن غداروں کی اولاد ہیں جنہوں نے اپنے وقت میں سب غاصب اقوام سے اپنے لوگوں کے خلاف تعاون کیا۔ جناب عالِی، حضورِ اعلیٰ، جہاں پناہ، یس سر، نو سر کہنے کے صِلے میں آج خان بہادر، جاگیردار صاحب اور سائیں وڈیرا کہلوانے والے یہ سب بہروپیئے دشمنِ عوام ہیں۔ جنہیں ورثے میں غداری اور اُن کی موجودہ جائداد اُس غداری کا مِلا ہوا انعام ہو وہ کیسے کبھی خلوصِ دل سے محبِ قوم ہو سکتے ہیں؟"

اس کے بعد کچھ منٹ خاموشی کا دور چلا، جب ارشد جمال کا طلاطم کچھ کم ہُوا تو اُس نے وسیم سے کہا "وسیم بھائی، کہتے ہیں کہ اگر ہیجڑوں کے گھر بیٹا ہو جائے تو وہ اسے روند روند کے مار دیتے ہیں۔"

"... چوم چوم کے مار دیتے ہیں۔" میں نے فوراً ارشد کی اصلاح کی۔

"سائیں جی! نہیں، وہ تو جسمانی طور پر مختلف لیکن فکری سطح پر ایک حد سے زیادہ شوقین ہیجڑوں کے متعلق کہا جاتا ہے؛ میں تو اُس قوم کے افراد کا ذکر کر رہا ہوں جو دیکھنے میں تو مکمل لگیں مگر شعوری طور پر ہیجڑے ہو چکے ہوں۔"

"آپ بہت سخت قسم کا الزام لگا رہے ہیں، ارشد میاں،" حاجی صاحب نے اپنی اِدھر اُدھر بکھری توجہ کو سمیٹ کر اُسے ارشد پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ لگاؤں؟ دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد کتنی اقوام نے آزادی کا جنم لیا تھا۔ ذرا گھوم کر جدید تاریخ پر نظر ڈالیں ... بھارت، چین، اسرائیل، انڈونیشیا، سری لنکا، ملیشیا، سنگاپور، برما، کوریا، ویت نام سب وہ ایشیائی ممالک ہیں جنہیں ہمارے ساتھ یا بعد میں آزادی ملی۔ آج یہ سب ممالک معاشی اور اقتصادی دوڑ میں ہم سے میلوں آگے بڑھ چکے ہیں۔ ان ممالک کی مذاہب مختلف، زبانیں مختلف، ثقافت مختلف مگر ایک چیز مشترک ہے ... انہوں نے خود اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کی، خود لڑے اور خود اپنا ملک حاصل کیا۔ اس لئے انہیں اپنی زمین، زبان، تہذیب اور قومیت پر فخر ہے اور وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی بمبئی کا وکیل نہیں بولا تھا، یا پورب، بہار اور مشرقی پنجاب کے شہید نہیں گرے تھے! ہمارے لئے بولا کوئی، لڑا کوئی، مرا کوئی۔ دوسروں کے جلتے گھروں سے ہم نے اپنی نئی تاریخ کا چراغ روشن کیا جس میں تیل کی بجائے لاکھوں معصوموں کا خون جلا، اور بلِا اپنے سر کا ایک بال گرائے ہمارے جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں کے ہاتھ میں دنیا کی چھٹی یا ساتوں سادہ لو خلقت آ گئی جسے انہوں نے کولہو کا بیل بنا کر، ملاّؤں کے دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کروانے کے بعد، ماضی کے قصّوں کے چکر میں گھما گھما کر شعوری طور پر بالکل خصّی کر دیا ہے۔ حاجی صاحب!

ہمارا ملک اس لئے بنا تھا کہ وہاں اب مسلمانوں سے کبھی زیادتی نہ ہو گی، "الرحمٰن الرحیم" کا نظام قائم ہوگا، ذات پات کی تقسیم کی جگہ انسانی اخوّت اور ہمدردی بڑھے گی، نہ کہ اس لئے کہ وہاں بد فطرت

خبیث کبھی خاکی وردی پہن کر کبھی بالوں کا نقاب لگا کر اسلام کے نام پر ہر انسان سے زیادتی کریں؟ آپ ہی بتایں، ہر روز آپ آ کر ان برہنہ دوشیزاؤں کے ساتھ بیٹھتے ہیں، کبھی کسی کی عزت خطرہ میں نظر آئی، کسی کی عصمت لُٹی؟ اس کے برعکس ہماری ہر عورت سے، چاہے وہ سر پر صرف چادر پہنے یا اپنے کو برقع میں مقیّد رکھے، ہمارے ملک میں ہر قدم پر سب ہوس کے مارے بصری زِنا کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بے حیائی کہاں ہے، یہاں یا وہاں؟"

حاجی صاحب، جن کی توجہ اس ابالِ ذہن سے زیادہ افراطِ زن پر مرکوز تھی، اِس براہ راست، غیر متوقع سوال سے کچھ گبھرا سے گئے۔ چند منٹ اپنی داڑھی کو سنوارنے کے بعدوہ بولے، "ارشد، تم اپنے دل کی بھڑاس نکالتے وقت ایک اہم فرق کو نظر انداز کر گئے: یہ سب کھیلیں اور مشغلے امیر قوموں کے تماشے ہیں چاہے وہ امریکہ کے کسی شہر میں ہو رہے ہوں یا سویڈن کے ایک ساحل پر۔ تم نے کپڑے اتار کر لیٹنے کو انسانی مُساوات قرار دے دیا ہے۔ شوقِ عریانی اور حقِ آزادی دو مختلف خیال ہیں۔ ہماری عورت کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں کے وہ برہنہ ہونے کو آزادی سمجھے۔ درحقیقت ہماری عورتیں اور یہاں کی عورتیں اپنی قدرتی جسمانی بناوٹ کی یکسانیت کے باوجود شعوری طور پر دو مختلف انسان ہیں۔ اُن کو ایک سمجھنا محض ایک سراب ..."

ارشد نے تیزی سے حاجی صاحب کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "آپ غلط طرف بات کو موڑ گئے حاجی صاحب، میں بھی

عریانی کا پرچار نہیں کر رہا۔ میرا زور اس امر پر ہے کہ ہر انسان خود تعیّن کر سکتا ہو کہ اُس کے جسم، دماغ، کام، محنت اور پیار کا کون کون حصہّ دار ہوگا۔ ویسے شائد آپ پر واضح نہیں کہ یہ جسے آپ عریانی کہتے ہیں وہ اِن کا شوق نہیں ضرورت ہے۔ اِس ٹھنڈے، برفانی ملک میں مشکل سے دو ماہ کی ایسی دھوپ نکلتی ہے کہ انسان اُس میں باہر بیٹھ سکے۔ اور یہ کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم کِس خدا کو سجدہ کرتے ہیں، یہ حقیقت سب باعلم انسان جانتے ہیں کہ زندگی کا دارومدار سورج پر ہے۔ دنیا کی ہر زندہ شے سورج کی شعاؤں سے ہی پھیلتی، پھولتی اور پھلتی ہے۔ ان سرد ممالک کے باسیوں کے لئے لازم ہے کہ وہ دھوپ کا غسل لیں ورنہ ان کے جسم کا دفاع کمزور پڑ جاتا ہے ...“

اچانک ارشد اپنے جملہ کے درمیان میں ہی اٹک گیا۔ حاجی صاحب کی نظر اس کی بجائے کہیں اور جمی ہوئی تھی۔ ان کی نگاہ کے تعاقب پر معلوم ہوا کہ وہ کانسی کے بنے دو زندہ مجسموں کو دیکھ رہے تھے — دو سہیلیاں آپس کی گفتگو میں محو راستے میں پڑے جسموں کے درمیان تنگ راستوں سے گزر کر ہماری جانب آ رہی تھی۔ اچانک قریب سے ایک لڑکے نے انہیں پکارا اور وہ اُس کی طرف چل دیں۔ اُس کے پاس پہنچ کر انہوں نے اپنے تھیلے نیچے رکھے اور پھر اُن میں سے اپنا اپنا تولیہ نکال کر خالی گھاس پر بچھانے لگیں۔ ایک تو اُس پر ویسے ہی بیٹھ گئی مگر دوسری نے پہلے اپنی جینز کی پینٹ اتاری اور پھر اپنے بلاؤز کا تسمہ کھول کر اُسے بھی تن سے کھینچ کر اپنے بدن کو تازہ ہوا کا غسل دیا۔ معلوم نہیں وہ اُس کی ”سہارنی“ کی چونچ تھی یا تپش

مگر بالکل یوں لگا گویا سورج گھبرا کر کوئی ڈیڑھ نیزہ پیچھے ہٹا ہو! تب ہوا کے ایک چنچل جھونکے نے اُس کے تولیے کا ایک پلّو اڑا دیا، جسے اس نے جھک کر ٹھیک کرنا چاہا۔ جھکنے پر اُس کی آنکھیں حاجی صاحب کی آنکھوں سے مِلیں۔ ایک معصوم، دل آویز مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھوٹ نِکلی۔ پھر اُس نے سویڈش انداز میں کہا "ہیئی، دادو ابّا!" حاجی صاحب کے چہرہ پر بھی کچھ کشمکش کے بعد اتنی ہی پیار بھری مسکراہٹ ابھری اور انہوں نے سر کے اشارہ سے اُس کو جواب دیا۔ وہ لڑکی اپنے دوستوں کے پاس لیٹ گئی۔

"حاجی جی! یہ سورج مکھی کا پھول کون ہے؟" ارشد کے منہ سے نِکلا۔

کچھ تذبذب کے بعد حاجی صاحب بولے "آج ... آج یہ میری گذشتہ بہو کی بیٹی ہے ... اسی کے ساتھ رہتی ہے۔"

"گذشتہ بہو کی بیٹی؟ کیا مارگرٹ کا پہلے سے بھی کوئی بچّہ تھا؟" ارشد نے ہی پوچھا۔

"نہیں تو۔" جواب مِلا۔

"تو پھر یہ آپ کی "گذشتہ بہو کی بیٹی" آپ کے بیٹے کی بیٹی اور آپ کی پوتی کب ہوتی ہے۔"

"جب یہ کبھی کبھار ہمارے گھر آکر شلوار قمیض کے ساتھ سر پر ڈوپٹہ بھی پہنے۔" حاجی صاحب نے آہستہ سے جواب دیا۔

دھنک

باہر بھی رات اتنی کالی تھی کہ بلیاں تک چاندنی کو ترس رہی ہوں گی۔ اُس نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں کو رفتہ رفتہ اپنے چہرے کے قریب لاتے ہوئے انہیں دیکھنے کی کوشش کی لیکن اُسے کچھ نظر نہ آیا، حتیٰ کہ وہ اُس کے اتنے قریب آ گئے کہ اُسے خود اپنے گالوں پر اُن کی تپش محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک ہاتھ سے اُس نے دوسرے کو بہت نرمی سے چھُو کر آہستہ سے اُسے آگے پیچھے پھیرا۔ کپکپاہٹ کی چند لہریں اُس کے پورے بدن سے گزر گئیں، پھر اُس نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھُپا لیا۔ کیا وہ بھی مجھے یوں ہی چھُوئیں گے؟ اچانک گھبرا کر اُس نے دائیں بائیں نظر ڈالی کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر اپنی گھبراہٹ پر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ وہ تو کمرے میں تھی ہی اکیلی؛ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو کسی کو اس گھُپ اندھیرے میں کیا دِکھنا تھا ! ایک مرتبہ پھر کپکپاہٹ نے اُس پر حملہ کیا۔ لیکن اُس کے بعد صرف اُن کی قربت کے تصوّر سے ہی اس پر ایک سُرُور کی سی کیفیت طاری ہو گئی، اور انگ انگ میں میٹھا درد رسنے لگا۔

اُس سُرُور کی کیفیت میں ہی اُس نے بنفشہ کے پھولوں کو دریا

کے کنارے اپنی جھاڑیوں پر لہلہاتے دیکھا۔ کیسے، جب کبھی بھی اُن پر تُند ہوا کی یلغار ہوتی، وہ بچھ بچھ سے جاتے تھے؛ لیکن جب ہوا کا زور ٹوٹ جاتا تو وہ چپکے سے اپنے سر اٹھاتے، اِک لمحہ ٹھٹھکتے، گویا دیکھ رہے ہوں کہ کوئی نیا ہلّہ تو نہیں ہو رہا، اور پھر دوبارہ اپنا رقص جاری کر دیتے۔ میں بھی ایسی ہی بنوں گی! اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر کبھی انہوں نے تُندی دکھائی تو میں بنفشہ کے رنگ میں ڈوب کر سارے طوفان کو گزر جانے دونگی، اور جب وہ دھیمے ہو جائیں گے تو اِن پھولوں کی مانند میں بھی اُن کا دل موہ لوں گی۔ اُس کا دِل چاہا کہ وہ جلدی سے باہر جا کر اُن عنابی پھولوں میں لیٹ جائے کہ اچانک بجلی چمکی اور وہ اپنے خواب سے جاگ سی گئی۔ پھر وہ گنتی گننے لگی تاکہ بادلوں کی گرج پر وہ اندازہ لگا سکے کہ بجلی والے بادل کتنی دور ہیں۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو اُسے سکون سا ہوگیا کہ یہ بجلی گرانے والے بادل نہیں تھے۔

ابھی کچھ دیر میں پو پھٹنے والی ہے، اُس نے سوچا۔ ساتھ ہی اُس کے ذہن میں پپیہے کی کوک اور بارش میں دھلے ہوئے جامنوں کی ساون کی ہوا کے شرارتی جھونکوں کے اشاروں پر ناچنے کی تصویر ابھری۔ اُسے جامنی رنگ کتنا پسند تھا! یہ جامنی رنگ آتا بھی تو ان خاص مہینوں میں ہی ہے، اور اپنے ساتھ کیسے کیسے دل فریب سماں لاتا ہے — اِدھر کوئل شور مچائے تو اُدھر پپیہا چہکتا ہے؛ کبھی بارش کے آسمان سے گرتے ہوئے دھارے ملہار سناتے ہیں، تو کبھی پتّوں سے ٹپکتی بوندیں طبلوں کا الاپ کرتی ہیں؛ یہاں فالسوں کی شربت کی غٹ غٹ،

وہاں ڈبّے میں جامنوں اور نمک کی ٹھپاٹھپ کے بعد زبان پر ایک ایک جامن کو ہولے ہولے چوسنا ! اُسے یکدم احساس ہُوا کہ اُس کا منہ لعاب سے بھرا پڑا تھا۔ وہ جامنوں کے خیال میں اپنی زبان کو ہی چوس رہی تھی، یا پھر یہ وہ اُن کی زبان ...! اس خیال سے تو اُس کا سانس تقریباً رک ہی گیا۔ اُس نے بہت آہستہ سے اپنی ہتھیلی سے پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کے قطروں کو صاف کرنے کے بعد دھیرے دھیرے اپنے سانس کو بحال کیا۔

ساون میں آسمان کی چادر کتنی گہری نیلی ہوتی ہے! لگتا ہے گویا اُسے دھونے کے بعد کسی نے اُسے نیل میں ڈبویا ہو اور پھر اُسے سوکھانے کے لئے بچھاتے وقت اس پر لاکھوں چمکتے، ٹمٹماتے موتی بکھیر دیئے ہوں۔ لیکن آج تو باہر نہ نیلی چادر دِکھے گی اور نہ ہی وہ موتی۔ صرف گہرے، موٹے بادلوں کا غلاف ہی نظر آئے گا اُس نے سوچا۔ ہاں، البتہ اگر وہ دِن چڑھنے پر دریا کنارے جائے تو نیل کنٹھ ضرور اُسے مچھلی کا شکار کرتے نظر آ جائے گا۔ مگر آج بھلا وہ گھر سے کیسے باہر اکیلی جا سکے گی؟ اُسے اپنی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اُس نے جلدی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اگر اماں نے ساتھ کے کمرہ سے سن لیا تو کیا کہے گی؟ اُس نے خود سے پوچھا۔ کیا کہے گی؟ وہی جو ہمیشہ کہتی ہے "اری لونڈیا، جاگتے میں مستی والے سپنے مت دیکھا کر، ورنہ سوتے ہوئے ڈراؤنے خواب آئیں گے" پھر اُسے اماں پر بھی ہنسی آ گئی، آہستہ سے بولی "اماں، اگر سپنے نہ دیکھوں تو اُس بخار کو، جو میٹھے میٹھے درد

کے ساتھ ہی تنہائی کی نیلی گھڑی میں چڑھتا ہے، توڑنے والا اُبال کیسے آئے گا؟"

نہیں، نہیں! اب نیلی گھڑیوں کے لمحے گزر چکے ہیں! ابھی اُس کی سکھیاں آئیں گی اور پھر وہ باہر آنگن میں جامن اور آم کے سبز درختوں تلے مِل کر جھولا چڑھائیں گیں۔ کتنی ہریالی ہے ہمارے آنگن میں! اور پھر وہ ٹیں ٹیں کرتے ہوئے سبز طوطے۔ اُسے آج تک سمجھ نہ آئی تھی کہ وہ اُن طوطوں سے پیار کرتی ہے یا نفرت۔ اِس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ اُسے اُن کا جامنوں کو درختوں پر بیٹھ کر کُتر کُتر کر نیچے پھینکنا انتہائی ناپسند تھا، اور وہ کمبخت اپنے سبز رنگ کی وجہ سے اُن ہرے پتوں میں نظر بھی تو نہیں آتے تھے؛ صرف اُن کی مستقل ٹیں ٹاں کی آواز آتی رہتی تھی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے کسی دن وہ غائب ہو جائیں تب بھی اُن کے بغیر ہر طرف بالکل خاموشی اور اداسی سی چھا جاتی تھی۔ وہ ابھی بھی پینگ چڑھانے کے مزے لے ہی رہی تھی کہ اُسے خیال آیا کہ آج کے دن تو جھولا بھی نہیں چڑھے گا۔ چلو چھوڑو اس جھولے کو، اب اپنے آنگن کی ہریالی سے نکل کر میں اُن کا کھیتوں میں ساتھ دوں گی!

اور پھر اُس کی آنکھوں میں سبزہ بھرے کھیتوں پر سرسوں کے پیلے تھان کھل گئے۔ یہ تصوّر اتنی شدّت سے آیا تھا کہ اُس نے پھولوں کی مہک تک کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیا؛ پھر اُس نے سر

گھما کر بند کھڑکی کے اوپر کھینچے ہوئے پردے کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں اُسے پردہ کیا دِکھنا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ بستر کی دائیں طرف سے اٹھ کر تین قدم، اور پردہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا۔ مگر ابھی اُس کو کھینچنے کا کیا فائدہ؟ سورج نکلے اور بادل چھٹیں تب ہی تو اُس کی کیسری دھوپ اپنے سب پجاریوں کو آکر نہلائے گی۔ اُس نے بھی تو کل سے پیلے کپڑے ہی پہنے ہوئے تھے! آج نامعلوم انہوں نے کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہوں گے؟ مرد تو پیلے کپڑے نہیں پہنتے، اور وہ جو پہنتے ہیں وہ کسی کنواری کا ہاتھ نہیں پکڑتے! نہیں بابا، وہ پیلے کپڑے ہرگز نہ پہنیں! میرے ہی کافی تھے۔ البتہ، اُن کے گلے میں گیندے کے زرد ہار خوب سجیں گے! اور اُس کا سارا کمرہ پھولوں کی مُدھری خوشبو سے بھر سا گیا۔ ارے میرا سر تو نہیں پھر گیا؟ اُس نے سوچا۔ کبھی سرسوں کی مہک اور کبھی گیندے کی خوشبو! حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی بھی اپنے کمرے میں بند پڑی ہوں۔ پہلے منہ تو دھویا جائے، پھر آج میں بھی پھولوں کا گجرہ جُوڑے میں باندھوں گی۔

شاید بارش کی جھڑی ہلکی ہو گئی تھی، کیونکہ یکایک باہر سے بجتے جل ترنگ کی موسیقی کی لے کچھ بھاری ہو گئی۔ "دیکھو!" اُس نے بادلوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "آج شام میری مانگ میں سندور بھرنا ہے، خبردار اگر تم نے کوئی شرارت کی تو؛ ورنہ میں نانو کی لاٹھی سے تمہیں اتنا پٹواؤں گی کہ تم پربت کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنے

نین بہاؤ گے!" اُس نے اپنی انگلی سے اپنی مانگ ڈھونڈ کر اپنی سر کی کھال کو محسوس کیا۔ آج کے بعد یہ بھی سانولی نہیں رہے گی۔ جب تک اُس کا سہاگ رہے گا اس کا رنگ بھی سندوری رہے گا، اور کاش کہ اُس کی مانگ ہمیشہ بھری رہے! وہ جانتی تھی کہ اندھیرے میں اُسے اپنی مہندی کے پھول ہتھیلی پر نہیں دکھیں گے، اس لئے اُس نے اپنی ہتھیلیوں کو اپنے گالوں پر رکھ کر اُن پھولوں کو اُسے چومنے دیا۔ چند لمحوں میں ہی اُس کے ہاتھ دھکنے لگے، لیکن اُس نے انہیں ہٹایا نہیں۔

"یہ میرے ہاتھ نہیں ہیں، بلکہ اُن کے!" وہ کیسے انہیں ہٹاتی؟

اُسے یقین تھا کہ اُس کے رخسار تپ کر کُسُم کی مانند لال ہو چکے ہوں گے۔ اُس کا سانس اب تیزی سے چل رہا تھا۔ اُس کے اندر کی لُو کے جھکڑ اُس کے کھلے ہونٹوں سے نکل کر اُس کے پورے وجود پر چھانے لگے۔ اُس نے زبان سے لبوں کو گیلا کرنا چاہا مگر کبھی کسی خشک زبان نے بھی ہونٹوں کو تری دی ہے؟ اُس نے اپنی زبان کو پھر پپڑیوں پر پھیرا۔ سانس کی تندی سے اُس کے سینے میں بھی ہل چل مچی ہوئی تھی۔ اُسے لگا گویا اُس نے چھوٹی بہن کی قمیض پہن رکھی ہو، اور اگر اُس نے اپنے طوفان پر قابو نہ پایا تو قمیض کے بٹن اُڑ جائیں گے۔ بہت مشکل سے اُس نے ایک ہاتھ کو ہٹا کر اپنے پیٹ پر رکھا کہ اپنے ہیجان کو مدھم کر سکے؛ مگر اُسے بس یوں لگا گویا سرخ انگاروں کو اُس کے گالوں سے اٹھا کر ناف کے پاس منتقل کر دیا گیا ہو۔ اُس کے ارد گرد، اندر باہر بس ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف سرخی ہی سرخی!

پھر اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کا بستر گھومنے لگا ہو ...دھیرے دھیرے ہر شے اُس کے گرد گھوم رہی تھی ... بنفشی پھول اپنی جھاڑیوں سے اُڑ کر جامن کے درختوں پر اٹک گئے ... آسمان نے جھک کر اُن درختوں کو اپنی نیلی چادر میں لپیٹ لیا... یکایک اُس نیلی چادر پر سبز جھومتی جھاڑیوں کی کونپلیں نِکلیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن پر پیلے پھول کھل گئے۔ کتنی جلدی سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا! اُس کے پٹھّے اکڑے ہوئے تھے اور کوئی موجوں بھرا سمندر اُس کے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اُس نے گھبرا کر اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹا کہ جذبات کے اُس بہاؤ کو بدل سکے؛ لیکن اب کچھ بھی بدلنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی پہاڑ سے گِر رہی ہو۔ پہاڑ کے دامن میں اُسے ایک مضطرب سندوری دریا بہتا دِکھائی دیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے پلنگ کو پکڑ کر اپنے کو ڈوبنے سے بچانا چاہا۔ تب اُس نے اپنے لب اتنی زور سے بھینچے کہ اُسے لگا سُرخ لہو اُن سے پھوٹ نِکلے گا۔ ہر چیز اب گردش میں تھی۔ بنفشہ، تلسی، کچنار، سوسن، سورج مکھی، گیندا، گلاب، انار، کُسم اور ناجانے کون کون سے دوسرے پھول اور پتے اُس کے گِرد گھوم رہے تھے ... چکر پہ چکر۔

پھر اُس کے منہ سے ایک کراہ کے ساتھ ہی چیخ سی نِکلی۔ اور پھر اور چیخیں ... دھیمی دھیمی، سِسکیوں والی چیخیں ... وہ بالکل بھیگ سی گئی تھی ... جیسے وہ اپنی آشنا کے ساگر سے نہا کر نِکلی ہو! تب ہر

چیز رفتہ رفتہ ساکن ہوگئی --- اُس کے اندر کا اندھیرا مٹ چکا تھا۔ اب
بس اُجالا ہی اُجالا تھا ... روشنی ہی روشنی ... کتنی سفید روشنی!

VKF Publication

Copyright © Saeed Anjum & Sain Sucha

First Published 1996

ISBN 91-86620-16-9

Published by Vudya Kitaban Förlag
Box 6099
S-192 06 Sollentuna
SWEDEN.

All rights reserved

Front cover: Sain Sucha
Set by: VKF, S- 192 06 Sollentuna, Sweden.
Printed by: International Tryck, Uppsala, Sweden.

SOCHAIN!

URDU
SHORT STORIES & IMPRESSIONS

by
SAEED ANJUM
and
SAIN SUCHA

VKF Publication

SOCHAIN!

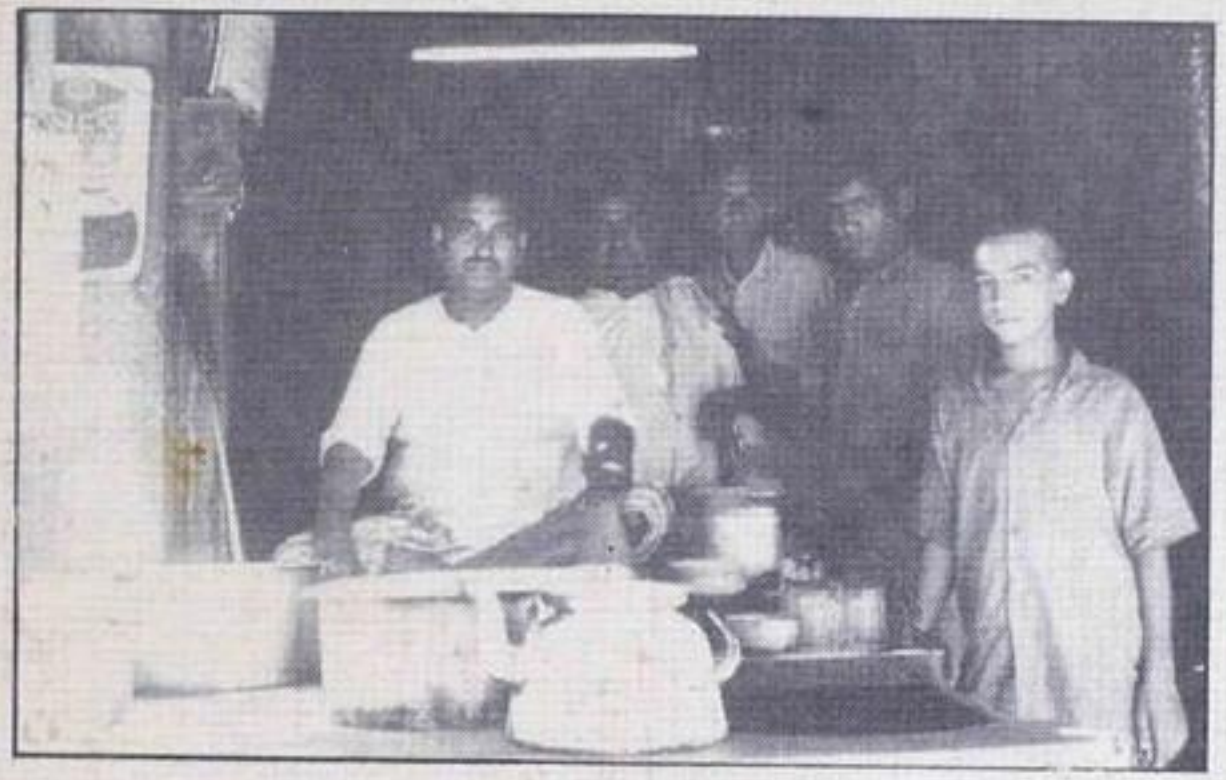

URDU

SHORT STORIES & IMPRESSIONS

by

SAEED ANJUM

and

SAIN SUCHA

ISBN: 91-86620-16-9
Published by: Vudya Kitaban, S-192 06 Sollentuna, Sweden.
Set by: VKF, S-192 06 Sollentuna, Sweden.
Printed by: International Tryck, Uppsala, Sweden.